بوڑھا پھٹھپسن

مسرور جہاں

(افسانے)

مسرور جہاں

ڈاکٹر
منیّر مسعود
کے
نام

ساتھ چلنے کی رسم ہے ورنہ
ہم سفر ہم سفر اکیلا ہے

— وقار ناصری

پیش نامہ

اردو افسانہ موضوع اور اسلوب کی سطح پر جہاں نئے امکانات روشن کر رہا ہے وہاں اظہار کے پیچیدہ ترین پیرایوں کی وجہ سے مبہم اور ناقابلِ فہم بھی ہوتا جا رہا ہے۔ علامت پسندی کے غالب رجحان نے نئے افسانہ نگار کو بالواسطہ اظہار پر مجبور کیا تو اس نے علامتی پیرائے کو پوری طرح سمجھے بغیر اختیار کر لیا۔ نتیجتہً بیشتر نیا اردو افسانہ مفہوم سے عاری اور معنیٰ سے محروم ہو گیا۔ بالواسطہ اظہار کے پیرایوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے نئے افسانہ نگار کی ایک بڑی مشکل از خود حل ہو گئی یعنی وہ واقعات و حادثات میں تہہ دار عناصر کی جستجو کرنے اور انھیں ایک مربوط معنوی نظام میں پیش کرنے کے جھمیلے سے بچ گیا۔ براہِ راست بیان کے مقابلے میں بالواسطہ اظہار کو اعلیٰ ترین تخلیقی پیرایہ سمجھ کر جو کچھ بھی لکھا گیا اسے علامتی اور استعاراتی اظہار کا نام دے دیا گیا درحالیکہ یہ اظہار ذی فہم اور معتبر قاری کے لیے بھی ایک معمہ بن گیا۔ ایسا نہیں ہے کہ اشاراتی پیرایہ مبہم یا مشکل پیرایہ ہے لیکن

اس پیرائے کو صحیح طور پر برت نہ سکنے کی وجہ سے ہی بیان میں پیچیدگی اور التباس پیدا ہوتا ہے اور موضوع اور اسلوب میں کوئی منطقی ربط قائم نہیں رہتا۔ علامت پسندی کے رجحان کے علاوہ بالواسطہ اظہار کو اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں سے بیشتر براہ راست بیان میں زیادہ دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس بیان میں موضوع اور اسلوب کو ایک دوسرے کا تابع ہونا پڑتا ہے۔ براہ راست بیان میں کسی وقوعے کو ایک مکمل افسانوی نظام میں ڈھالنا اس قسم کے بالواسطہ بیان کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہے جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔

زیر نظر افسانے صاف اور بے پیچ اسلوب میں لکھے گئے ہیں جو اپنے موضوع کے ابلاغ میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ سرور جہاں نے جس اسلوب کو منتخب کیا ہے، بہ اعتبار موضوع اسے مثالی اسلوب کہا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوع اور اسلوب ایک دوسرے سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ افسانہ شروع کرتے ہی اس کا موضوع اس کے اسلوب سے برآمد ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لیے افسانہ نگار کے پہلے افسانوی مجموعے "دھوپ دھوپ سایہ" سے ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ افسانہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"ابھی ابھی میت گھر سے باہر گئی ہے:
ذرا دیر پہلے جس جگہ مرنے والے کا پلنگ تھا اب وہ جگہ خالی ہے بس ایک کوری ہانڈی میں لوبان سلگ رہا ہے جس کا بوجھل دھواں باہر نہ جا کر وہیں چکراتا پھر رہا ہے۔
ایک کنارے چوکی پر کلام پاک کے پارے رکھے ہیں۔ کچھ بیبیاں مرحوم کے قریب بیٹھی تلاوت کر رہی تھیں تاکہ مرنے والے کی روح کو سکون ہو اور مقدس آیات کے سہارے اس کا آخری سفر آرام سے کٹ جائے" (رشتہ۔ دھوپ دھوپ سایہ ص ۶۳)

یہ ایک ایسے گھر کا منظر ہے جہاں سے ایک میت ابھی ابھی باہر گئی ہے اور اس کو پیش کرنے کے لیے جس طرح کا اسلوب استعمال کیا گیا ہے وہ مناسب ترین اسلوب ہے۔ افسانہ نگار نے اس منظر نامے کو مرتب کرنے کے لیے جن جزئیات کو منتخب کیا ہے وہ ہمارے سامنے ایک المناک منظر کو پوری طرح اجاگر کر دیتے ہیں۔ یہ جزئیات ہیں: کوری ہانڈی، لوبان، دھواں، چوکی، کلامِ پاک کے پارے اور بیبیاں — کوری ہانڈی میں لوبان کا سلگنا؛ اس لوبان سے نکلنے والے بوجھل دھوئیں کا باہر نہ جا کر وہیں چکراتا پھرنا، چوکی پر کلام پاک کے پاروں کا رکھا ہونا اور کچھ بیبیوں کا مرحوم کے قریب بیٹھ کر تلاوت کرنا — یہ سب اس منظر کی عکاسی کے لیے بنیادی اور لازمی جزئیات معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار نے نہ صرف یہ کہ اس منظر کو بیان کرنے کے لیے ان جزئیات کا انتخاب کیا ہے بلکہ جس لفظی نظام کے تحت ان جزئیات کو پیش کیا ہے اس نے انھیں اور زیادہ پر اثر بنا دیا ہے۔ یہاں ضمناً یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مسرور جہاں کے افسانوی اسلوب میں کہیں کہیں غیر شعوری طور پر علامتی عناصر بھی دَر آئے ہیں۔ ان افسانوں سے متعلق علامتی عناصر کی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی۔ لیکن میں پہلے عرض کر دوں کہ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ افسانہ نگار نے ان عناصر کو شعوری طور پر استعمال کیا ہے یا غیر شعوری طور پر، اصل بات یہ ہے کہ اس اسلوب سے مصنف کے مفہوم کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم برآمد ہوتا ہے یا نہیں۔ نقل کردہ اقتباس اپنے جزئیات کے ذریعے جس المیہ ماحول کی عکاسی کر رہا ہے وہ پورے افسانے پر حاوی ہے، لیکن اس سے پہلے کہ اس ماحول کی وضاحت کی جائے آپ اس افسانے کا مرکزی موضوع سمجھ لیجیے:

> "بائیس سال پہلے کی بات ہے جب اسے محسن میاں (مرحوم کا نام) کے دامن سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی اور محسن میاں بینتالیس سال کے تھے۔ کچھ عجیب سا رشتہ تھا......"

"داخلے کا رجسٹر بھرنے والے ڈیوٹی ڈاکٹر نے مریض کا نام اور عمر
پوچھنے کے ساتھ سرسری طور سے ان سے یہ بھی پوچھ لیا مریض سے آپ کا کیا
رشتہ ہے۔؟
وہ چونک پڑی ....."

افسانے کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

"اچانک فضا میں دوبارہ سسکیاں گونج اٹھیں اب وہاں موجود سب
ہی بیبیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مرنے والے سے اس کا کیا رشتہ تھا۔"

ان سطروں سے شوہر اور بیوی کی عمر کا فصل بھی معلوم ہو جاتا ہے اور اس فصل کے نتیجے میں مرحوم اور راوی (مرحوم کی بیوی) کے درمیان کش مکش بھی ظاہر ہوتی ہے۔
اب پھر اس اقتباس پر نظر کیجیے جس سے افسانہ شروع ہوتا ہے:

"بوجھل دھواں باہر نہ جا کر وہیں چکراتا پھر رہا ہے .... کلام
پاک کے پاروں کی تلاوت ہو رہی ہے تاکہ مقدس آیات کے سہارے
مرنے والے کا سفر آرام سے کٹ جائے۔"

یہ بوجھل دھواں جو باہر نہ جا کر وہیں چکراتا پھر رہا ہے ایک نئے المیہ ماحول کا پیش خیمہ ہے جو محسن میاں کی موت کے بعد پیدا ہونے والا ہے۔ کلام پاک کی تلاوت اور مقدس آیات اس تقدیس اور پاکیزگی کی نمائندگی کر رہی ہیں جس کا لحاظ محسن میاں کی کم عمر بیوی کو تہمت زدگی سے بچنے کے لیے بقیہ ساری زندگی کرنا ہے۔ اور یہ کشمکش فی نفسہ ایک المیہ ہے۔ یعنی افسانہ حزنیہ اسلوب کے ذریعہ شروع میں جس المیہ ماحول کی تخلیق کرتا ہے وہ اختتام تک اسی طرح برقرار رہتا ہے اور اس طرح افسانہ شروع ہوتے ہی اس کا موضوع اس کے اندر سے برآمد ہوتا ہے معلوم ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے آپ اس تجزیے سے اتفاق نہ کریں اور ممکن ہے خود افسانہ نگار بھی اس سے متفق نہ ہو لیکن مندرجہ بالا پہلے اقتباس کے اسلوب سے جو مفہوم نکالا گیا ہے اسے بہر حال بعید از امکان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور یہی اس اسلوب کی خوبی ہے

کہ یہ اپنے موضوع سے معنوی ربط قائم رکھتا ہے۔

مسرور جہاں کے بیشتر افسانے اسی اسلوب پر مشتمل ہیں۔ ہر چند کہ ان کی زیادہ تر کہانیاں ایک مخصوص ماحول میں نمودار ہونے والے وقوعوں کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن اسلوب پر ان کی غیر معمولی گرفت نے اس ماحول کی یکسانی میں تنوع پیدا کر دیا ہے۔ عموماً افسانہ نگار اپنے افسانوں میں نئی موضوعاتی جہتیں پیدا کرنے کے لیے ایک وسیع تر تناظر کی جستجو کرتا ہے اور اس وقت موضوعات کی تلاش کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک مخصوص اور محدود ماحول سے نئے موضوعات اخذ کرنا اور ان میں مختلف معنوی پہلو پیدا کرنا یقیناً ایک دشوار ترین مرحلہ ہے۔ بوڑھا یوکلپٹس کے خالق نے اس مرحلے کو اس طرح طے کیا کہ ایک طرف انھوں نے اپنے اسلوب کو زیادہ سے زیادہ بامعنی بنانے کی کوشش کی اور دوسری طرف اس محدود فضا سے جنم لینے والے واقعات میں کسی فلسفیانہ نظام کو تلاش کرنے کے بجائے ان میں مضمر مختلف نفسیاتی پہلوؤں کو سامنے رکھا۔ انسانی زندگی سے متعلق یہی چھوٹے چھوٹے نفسیاتی پہلو ایک منظم اور مستحکم انسانی فلسفے کی مبادیات کا کام دیتے ہیں۔ انھیں بظاہر غیر اہم اور معمولی نفسیاتی نکتوں کی شرحوں سے ایک منضبط فلسفیانہ نظام کی تشکیل ہوتی ہے۔ مسرور جہاں نے ان نکتوں کی وضاحت کے لیے اس اخلاقی نظام کو موضوع بنایا ہے جو ایک طرف ایک اعلیٰ اور مخصوص تہذیب کے زوال کے اسباب کا اشاریہ فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف اس تہذیب کے صالح اور مثبت پہلوؤں کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ "نور بے نور"، "اللہ تیری قدرت"، "نامحرم"، "بیٹیے بندی" اور "بھرم" وغیرہ کہانیاں اسی نظام کی آئینہ دار ہیں۔ "نور بے نور" میں جب سکندر مرزا سیدانی بی کے حسن سے مسحور ہو کر ان سے عقد کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سیدانی بی کو پہلی بار محل سرا کی اونچی دیواروں اور آہنی دروازوں کے پیچھے تحفظ کا خیال مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ وہ دولت کی دولت کے سامنے جھکنے کے بجائے اپنی

جان دے دیتی ہیں اور نواب سکندر مرزا اپنے منصوبے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ سیدانی بی کی موت نواب پر کچھ ایسا اثر کرتی ہے کہ وہ ہوس کے ہیجان سے نکل کر مرگ کے ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بالآخر اپنی زندگی بھی ختم کر لیتے ہیں۔ پورا افسانہ خیر و شر کے تصادم کو بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ پہلے یہ تصادم، سیدانی بی اور نواب سکندر مرزا کے مابین برپا ہوتا ہے اور سیدانی بی کی موت کے بعد یہی تصادم سکندر مرزا اور ان کی اصل شخصیت کے درمیان شروع ہوتا ہے۔ "نامحرم" میں اس نفسیاتی نکتے کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے کہ عورت بیوی کی حیثیت سے بھی جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جمالیاتی پہلو کو بہرحال فراموش نہیں کرتی۔

اس طرح کی نفسیاتی موشگافیاں ان افسانوں میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ حالانکہ افسانہ نگار نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے عام واقعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان میں بھرپور معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان افسانوں میں نہ تو کائناتی مسائل پیش کیے گئے ہیں اور نہ مابعد الطبیعاتی موضوعات۔ پھر بھی ان کہانیوں سے انسانی زندگی سے متعلق بعض اہم اور بنیادی مسئلوں کے بارے میں ایک عام نظریہ قائم کرنے میں ضرور مدد ملتی ہے۔

مسرور جہاں کے دوسرے افسانوں میں "بوڑھا یوکلپٹس"، "سیڑھیاں" اور "وقت وقت کی بات" وغیرہ چھوٹے چھوٹے انسانی المیوں کو پیش کرتے ہیں لیکن ان المیوں میں آفاقی تجربوں کا عکس نظر آتا ہے۔ "مٹی کا مول" ایک عالمی انسانی المیے کو پیش کرتا ہے۔ یہاں مجھے اس سے انکار نہیں کہ مسرور جہاں کے پیشرو افسانہ نگار اس المیے کو زیادہ مہارت اور کمال کے ساتھ اپنے افسانوں کا موضوع بنا چکے ہیں لیکن مٹی کا مول میں اس المیے کا اختتام اسے دوسرے افسانوں سے بہتر نتیجہ خیز و منفرد بنا دیتا ہے۔

آخر میں سرور جہاں کے ایک اور وصف کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ مرکزی موضوع سے متعلق مختلف منظروں کی عکاسی کے لیے وہ جس طرح کی فضا تعمیر کرتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں افسانوی نثر پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ اس طرح کے ایک دو منظر ملاحظہ کیجیے:

"سیدانی بی غسل کر کے آئی تھیں۔ ان کے لمبے سیاہ بالوں کی نوکوں پر شفاف پانی کے قطرے بکھرے کے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ سفید جنگل باڑی کا دوپٹہ نماز کے انداز میں سر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ انھوں نے نذر دی اور پھر دیر تک محل سرا کے مالکوں کی صحت، خوش حالی اور درازیِ عمر کی دعائیں مانگتی رہیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے"

یہاں سیدانی بی کا سراپا کھینچا گیا ہے اور اس طرح کہ سیدانی بی ہمیں اپنے سامنے موجود اور متحرک نظر آنے لگتی ہیں۔

ایک اور منظر دیکھیے:

"دیوار میں لگے ہوئے پیتل کے چمک دار سہ شاخے میں ایک موم بتی روشن تھی جس کی زرد روشنی میں نواب سکندر مرزا کو سیدانی بی نظر آگئیں۔ ان کا جسم چھت کے قلابے میں رسّی کے سہارے جھول رہا تھا۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں"

ان سطروں میں موت کا منظر پیش کیا گیا ہے جسے سہ شاخے میں روشن موم بتی کی زرد روشنی نے سوگوار اور پُراسرار بنا دیا ہے۔ یہاں سرور جہاں کے اسلوب کی ایک اور خوبی سامنے آتی ہے۔ مضمون کے شروع میں جو اقتباس نقل کیا گیا ہے اس میں بھی درج بالا اقتباس سے ملتا جلتا منظر کھینچا گیا ہے۔ لیکن دونوں منظروں میں فرق یہ ہے کہ درج بالا اقتباس میں محض ایک فضا کی تعمیر کی گئی ہے اور منظر سے کسی مفہوم کو اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے لیکن پہلے والا منظر محض منظر نہ رہ کر

ایک مفہوم کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اسلوب کے اس فرق سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ افسانہ نگار سیاق و سباق کے لحاظ سے مختلف اسلوبیاتی پیرایوں کو برتنے کا فن جانتا ہے۔

اس طرح نئے افسانہ نگاروں کے یہاں موضوع اور اسلوب کی جس متابعت نے بُعدِ مشرقین کی حیثیت اختیار کر لی ہے، مسرور جہاں کے افسانوں میں وہ قِران السعدین بن گئی ہے۔ افسانے کے بنیادی محاسن متعلق آپ نے ان کہانیوں میں جہاں بہتر اور نمایاں مثالیں ملاحظہ کی ہیں وہاں آپ کو ان میں کچھ کمزوریاں بھی نظر آسکتی ہیں، لیکن یہ کمزوریاں نہ تو قابلِ لحاظ کہی جا سکتی ہیں اور نہ ہی ان افسانوں کے نمائندہ خصوصیات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اپنے افسانوں کے انہیں خصوصیات کی بنا پر مسرور جہاں ہم عصر افسانہ نگاروں سے کہیں زیادہ منفرد اور ممتاز نظر آتی ہیں۔

انیس اشفاق

۱۸ جنوری ۱۹۸۲ء

عکس

نُورِ بے نُور

بڑی بڑی روشن آنکھیں، جیسے سچے موتی کوٹ کر بھر دیے گئے ہوں۔ اور ان میں پھیلا ہوا گلابی ڈوروں کا جال کہ جس طرف نظر اٹھ جائے، تڑپتی مچلتی، بجلیاں گراتی جوانیاں خود بخود اس جال میں پھنس جائیں۔ آہوئے وحشی کے مانند چوکنی نگاہ، ستاروں کی سی چمک لیے تابناک پتلیاں اور عقاب کی سی تیز نظر کہ جب سے ہوش سنبھالا، ان نظروں کی زد سے ایک محل سراہی کیا، ملک شہر کی حسین صورتیں اور مونہہ زور جوانیاں محفوظ نہ رہ سکیں۔ اور اب اچانک وہ آنکھیں ایسی بےنم ہوئیں کہ دن کے اجالے بھی گھور اندھیروں میں بدل گئے۔

اس کے بعد تو نواب سکندر مرزا نے خود کو اپنی خواب گاہ میں گویا قید کر لیا۔

آنکھوں کی بیماریوں کے ایک سے ایک بڑے ماہر حیران تھے کہ یہ کون سا روگ لگا ہے، جس نے پلک جھپکتے میں آنکھوں کی روشنی چھین کر ایسے کڑیل جوان، خوبصورت اور صاحبِ اقتدار انسان کو یوں بے بس بنا دیا۔ لیکن خود

سکندر مرزا کو کوئی حیرت نہیں تھی - وہ تو اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ بڑی سزا کا حق دار سمجھتے تھے - یوں تو وہ ایک عادی قسم کے گناہگار تھے - اب تک نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو انھوں نے کبھی بہلا پھسلا کر اور کبھی زور زبردستی سے رام کیا تھا - لیکن اس بار تو جیسے احساسِ گناہ ان کے ضمیر کو آری بن کر چیر رہا تھا اور وہ جیسے اپنے آپ سے منھ چھپائے پھر رہے تھے - اور پھر ضمیر کی چبھن اتنی بڑھی کہ ان کے شب و روز جلتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے اور ان شعلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی روشن اور تابناک زندگی کو جلا کر بھسم کر ڈالا - اب ان کے سامنے لامتناہی اندھیروں کے سوا کچھ نہیں تھا - اور ان اندھیروں کے پیچھے انھیں بس ایک ہی صورت نظر آتی تھی ـــــ سیدانی بی کی صورت - اور ان کی آنکھوں میں ایک ہی منظر منجمد ہو کر رہ گیا تھا وہ منظر تھا ....

پہلے روز جب سیدانی بی نے محل سرا میں قدم رکھا تو مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل گئیں - انھوں نے تو کبھی خواب میں بھی ایسی شان دار، خوبصورت اور سجی سجائی حویلی نہیں دیکھی تھی - وہ اپنے باپ کے چھوٹے سے بوسیدہ گھر سے رخصت ہو کر سید صاحب کے گھر آئیں تو وہ بھی اتنا ہی پرانا اور بد وضع مکان تھا - سید صاحب محل سرا کی مسجد کے نگراں اور مؤذن تھے - اس کے ساتھ ہی وہ محل سرا کے جملہ مذہبی امور بھی انجام دیتے تھے، کہ آلِ سادات ہونے کا شرف انھیں حاصل تھا - اور شہر کے رؤسا و امرا سادات کا بے حد احترام کرتے تھے -

سید صاحب کا دونوں وقت کا کھانا محل سرا سے آجاتا تھا - تنخواہ قلیل تھی، لیکن ان دونوں میاں بیوی کے گزارے کے لیے کافی تھی - رمضان اور عید پر کپڑا لتا بھی سرکار دلہن صاحب ہی بنواتی تھیں - ویسے بھی ان جیسے لوگوں کا خرچ ہی کیا ہوتا ہے - اس لیے جب ایک مختصر سی علالت کے بعد سید صاحب کا انتقال ہو گیا تو گھر میں اتنا بھی پیسہ نہیں تھا کہ مرحوم کی تدفین ہو سکتی - اس وقت نواب سکندر مرزا نے بڑی ہمدردی دکھائی - انھوں نے سارا انتظام کیا اور شام سے پہلے ہی

سیّد صاحب کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ سرکار دلھن نے بھی غم زدہ سیدانی بی کو دلاسا دیا، اور چہلم کی فاتحہ کے بعد انھوں نے سیدانی بی سے محل سرا ہیں، ہی رہنے کے لیے اصرار کیا۔ اپنی تنہائی اور کم مائیگی کے خیال سے انھیں یہ بات ماننا ہی پڑی۔

امام باڑہ سے ملحقہ دالان سیدانی بی کی رہائش کے لیے ٹھیک کر دیا گیا۔ اس حصّے میں سوا کچھ خاص موقعوں کے کوئی مرد نہیں آتا تھا۔ اب محل سرا کی صاحب زادیوں کو بھی سیدانی بی کی تحویل میں دے دیا گیا کہ وہ انھیں کلامِ پاک پڑھائیں اور مذہبی تعلیم بھی دیں۔ ان ساری خدمات کے صلے میں سیّد صاحب کو ملنے والی تنخواہ کچھ اضافہ کے ساتھ سیدانی بی کو ملنے لگی۔

سیدانی بی کو امید سے زیادہ توجہ اور عزّت ملی تو وہ خدا کا شکر بجا لائیں۔ ہر نماز کے بعد وہ محل سرا کے ہمدرد اور غریب پرور مالکوں کے لیے دعائے خیر کرنا نہیں بھولتی تھیں۔ یوں بھی وہ اس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جس کا مسلک ہی نیکی، صبر اور قناعت تھا۔ چند ہی مہینے میں سیدانی بی کا رنگ و روپ نکھر آیا۔ غربت کی تہوں کے نیچے دبی ہوئی ملاحت ابھرنے لگی۔ سفید بے شکن لباس نے حُسن کو مزید پاکیزگی اور تقدس بخشا۔ انھیں دیکھ کر حوروں کی حقیقت پر ایمان لانا پڑا۔ محل سرا کی حسین بیگمات کے بیچ وہ اس طرح نظر آتیں جیسے ستاروں کے درمیان ماہتاب۔

محل سرا کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ نذر و نیاز میں سیّدوں کو فوقیت اور برتری حاصل تھی۔ سیّد ہی فاتحہ دیتے تھے۔ دسترخوان پر نذر کا پہلا لقمہ بھی وہی چکھتے تھے۔ اس کے بعد مالکوں کا نمبر آتا تھا کہ وہ اہلِ سادات نہیں تھے۔۔۔

محل سرا میں بائیسؔ رجب کے کونڈے روایتی اہتمام سے ہوئے۔ مٹی کے چودہ کورے کونڈوں میں میٹھی ٹکیاں بھری گئیں۔ چودہ کونڈے شیرے کی

پوریوں کے تھے۔ تانبے کے قلعی دار کانسوں میں کھیر تھی۔ اس کے علاوہ نمکین میں شیرمال، کباب، پوری، قیمہ، قورمہ اور دہی بڑے تھے۔ ساری رات معتبر باورچیوں اور رکاب داروں نے نذر کا سامان تیار کیا۔ فجر کی نماز کے بعد دسترخوان سجا دیا گیا۔ سرکار دلھن نے گنگا جمنی شمع دانوں میں چودہ موم بتیاں روشن کیں اور اگر دان میں اگربتی سلگائی۔ چاندی کے گیارہ روپے چوائی کے رکھے اور پھر سیدانی بی کو نذر دینے کا اشارہ کیا جو ان کے قریب ہی منتظر کھڑی تھیں۔

سیدانی بی غسل کر کے آئی تھیں۔ ان کے لمبے سیاہ بالوں کی نوکوں پر شفاف پانی کے قطرے بکھرے کے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ سفید جگل باڑی کا دوپٹہ نماز کے انداز میں سر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ انھوں نے نذر دی اور پھر دیر تک محل سرا کے مالکوں کی صحت، خوش حالی اور درازیِ عمر کی دعائیں مانگتی رہیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ کہ اسی وقت نواب سکندر مرزا وہاں آگئے۔ ان کی نظر سیدانی بی پر پڑی تو وہ دہیں سہ دری میں رک گئے اور مسحور سے ان کے ملکوتی حسن کو دیکھتے رہ گئے۔ پاکیزگی اور حسن کا اس سے زیادہ خوبصورت امتزاج اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گلابی ڈورے سُرخ ہوگئے۔ نظارۂ حُسن کے نشے سے ان کی آنکھیں بوجھل ہوگئی تھیں۔ اور ان میں تارے ٹوٹنے لگے تھے۔

سیدانی بی ان نظروں سے بے خبر دعا مانگ رہی تھیں۔ دعا مانگتے ہوئے ان کے پتلے پتلے ہونٹ پھولوں کی پنکھڑیوں کی مانند حرکت کر رہے تھے۔

"سیدانی بی نذر رکھیو"۔۔۔۔

سرکار دلھن کی آواز سن کر سکندر مرزا چونک اٹھے، اور جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر آڑ میں ہوگئے۔ ایک حسین طلسم تھا جو ٹوٹ گیا مگر وہ ہوش میں

آکر بھی مدہوش ہی رہے۔

سیدانی بی نے نذر رکھی تھی۔ سرکار دلھن نے چراغی کے روپے ان کو دیے کہ یہ نذر دینے والے کا حق ہوتا ہے۔ پھر سیدانی بی سرکار دلھن سے اجازت لے کر چلی گئیں۔

نواب سکندر مرزا نے برائے نام نذر چکھی اور طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کر کے جلدی سے رخصت ہو گئے۔ اپنی خواب گاہ میں لیٹے ہوئے وہ بند آنکھوں سے حسن اور معصومیت کی مورتی کو دیکھتے رہے۔ اور نظروں سے اسے دل میں اتارتے رہے۔

سیدانی بی کے بیک وقت سادہ اور پُرکار حسن نے ان کا صبر و قرار لوٹ لیا تھا۔ اب وہ اس دُرِ بے بہا کو حاصل کرنے کے طریقے سوچ رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب نواب سکندر مرزا کو کسی عورت کے حصول کے لیے سوچنا پڑ رہا تھا ورنہ ہمیشہ تو یہ ہوتا تھا کہ جو عورت انھیں پسند آئی، ہاتھ بڑھا کر پکے پھل کی مانند توڑ لیا۔ لیکن اس بار مصیبت یہ تھی کہ پھل بہت اونچائی پر نظر آ رہا تھا۔ نہ وہ ہاتھ بڑھا سکتے تھے۔ نہ ڈالی نیچے جھک سکتی تھی اور یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جو چیز رسائی سے دور نظر آتی ہے، اس کے حصول کی تڑپ کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

کئی دن کے سوچ بچار کے بعد نواب سکندر مرزا نے اپنی خاص خادمہ خیرن کو بلایا، وفاداری اور رازداری کا حلف لے کر ساری باتیں اچھی طرح سمجھا کر اسے سیدانی بی کے پاس بھیجا۔

سیدانی بی نے رنگین پیڑھی خیرن کو بیٹھنے کے لیے دی۔ وہ اپنی نواڑ کی پلنگڑی پر بیٹھی دوپٹے میں لیس ٹانک رہی تھیں۔ بچیاں پڑھ کر جا چکی تھیں، مغرب کی نماز میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔

خیرن نے پان کی گلوری سلام کر کے قبول کی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے

لگی۔ دراصل وہ حرف مدعا زبان پر لاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ سیدانی بی کے بُشرے سے ٹپکنے والی شرافت اور نیکی نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔ لیکن یہ خیال رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ ابھی سکندر مرزا کو واپس جا کر جواب بھی دینا ہوگا۔ اس لیے بڑی ہمت کر کے اس نے گفتگو کا سرا پکڑا اور بڑی اپنائیت اور خوشامد سے کہنے لگی۔

"بی بی، اللہ قسم آپ کو دیکھ کر میرا جی بڑا کڑھتا ہے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ اس پر یہ رنڈاپا۔ ہائے، ہائے! ابھی تو آپ کی کھانے پہننے کی عمر ہے۔"

"پروردگار کی مرضی میں بندے کا کیا دخل ـــ ہمیں اس کی رضا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے خیرن"

"وہ تو ٹھیک ہے بی بی، لیکن ابھی تو پہاڑ سی زندگی باقی ہے۔ اس طرح کیسے گزرے گی؟"۔

"پہلے تو میں بھی یہی سوچتی تھی، لیکن اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے، خدا سرکار دولھن صاحب کو سلامت رکھے بڑی عزت اور بے فکری سے گذر رہی ہے"۔ سیدانی بی نے بڑی طمانیت اور سکون سے کہا ـــ

"بی بی ـــ یہ تو آپ کی شرافت ہے۔ لیکن عقد ثانی کی اجازت تو شرع نے بھی دی ہے۔"

"میں تو اس بارے میں سوچتی بھی نہیں، اور نہ میری غیرت ہی اسے قبول کرے گی کہ شوہر کے انتقال کے بعد دوسرے مرد کا منھ دیکھوں"۔

"بی بی خطا معاف ہو۔ اگر کوئی اور آپ کے بارے میں سوچے، آپ کی خاطر دن کا چین، راتوں کی نیند حرام کرلے، تب تو آپ کو سوچنے میں تامل نہ ہوگا"۔

"یہ ـــ یہ تم کیا کہہ رہی ہو خیرن؟"ـــ

سیدانی بی سٹپٹا گئیں۔ مارے شرم کے ان کا چہرہ لال ہوگیا، مارے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بی بی ــــ ہمارے سرکار نے جب سے آپ کو دیکھا ہے، بے قرار ہیں - وہ آپ سے عقد کرنا چاہتے ہیں"ــــ

"سرکار ــــ نہیں نہیں -؟ آئیندہ تم یہ بات منھ سے کبھی نہ نکالنا - اگر سرکار دلھن صاحب نے سن لیا تو میری عزت مٹی میں مل جائے گی - ایک گوشہ میں بیٹھی سکون سے دو روٹی کھا رہی ہوں، یہ سہارا بھی ختم ہو جائے گا"

"آپ دو روٹی کی بات کر رہی ہیں بی بی ــــ وہ تو شہر والی کوٹھی مہر میں آپ کے نام لکھنے کو تیار ہیں - ہزار روپیہ تو اس کا کرایہ ہی آتا ہے، پھر کپڑا لتا اس کے علاوہ ہے - وہ آپ کے عیش و آرام کا پورا خیال رکھیں گے - بس آپ ہاں کر دیجئے"

"پروردگار انھیں اپنے خزانے سے اور زیادہ دے، ان کی پھلواری ہری بھری رہے - بس اب تم جاؤ میری نماز کا وقت ہو رہا ہے"

سیدانی بی نے وضو کر کے نماز پڑھی - اس دن شوہر کے انتقال کے بعد پہلی بار آنسوؤں سے سجدہ گاہ تربتر ہو گئی - بار بار انھیں خیال آ رہا تھا کہ اس چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں وہ کتنی محفوظ اور پرسکون تھیں - محل سرا کی اونچی دیواروں اور آہنی دروازوں کے پیچھے تحفظ کا خیال کتنا مضحکہ خیز ثابت ہوا تھا -

سکندر مرزا نے سیدانی بی کا انکار سنا تو انھیں ان پر غصہ نہیں آیا، ترس آ گیا - عجیب عورت اپنی قدر و قیمت خود نہیں جانتی - وہ تو ایسا کوہ نور ہے جسے دل میں چھپا کر رکھنے کو جی چاہتا ہے -

انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور چند روز کے بعد پھر خیرن کو بھیجا ــــ اس بار بھی صاف جواب ملا - خیرن پھر گئی، اور اس کے بعد بار بار جاتی رہی، مگر ادھر سے ہر بار انکار تھا، صاف انکار - کسی طرح کا لالچ کام نہ آیا - ہر حربہ، ہر تدبیر ناکام ہو گئی - ایک دن تو غصے میں آ کر انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ محل سرا چھوڑ دیں گی - سرکار کو اپنی دولت کا غرور ہے - وہ ان کا یہ غرور چکنا چور کر دیں گی

اور انھیں بتادیں گی کہ ہر عورت مٹی کا کھلونا نہیں ہوتی کہ جب پسند آجائے یہ امیرزادے اس سے کھیل لیں۔ نہ ہر عورت بکاؤ ہوتی ہے کہ قیمت دے کر سودا کرلیں۔ شریف عورت اپنی عزت نہیں بیچ سکتی۔ عزت کے بدلے وہ جان دے سکتی ہے۔

اب کی بار سیدانی بی کا تیز و تند جواب سن کر سکندر مرزا آپے سے باہر ہوگئے۔ اس دو ٹکے کی عورت کو جو اُن ہی کے ٹکڑوں پر پل رہی ہو، ایسا غرور جیسے کہیں کی شاہزادی ہو۔ عزت! عزت! عزت؟ — کیا اسے عزت نہیں کہیں گے جو وہ اس عورت کو دینے کے لیے تیار ہیں؟ کوئی امیرزادہ خاندان سے باہر کی عورت کو یہ عزت دیتا ہے جو وہ دے رہے ہیں۔ عقد کر کے وہ اُسے عزت اور مرتبہ دے رہے ہیں، اپنی نکاحی بیوی بنا رہے ہیں، اور وہ ہے کہ اسے اپنی بے عزتی سمجھ رہی ہے!۔

سکندر مرزا نے مارے تاؤ کے اپنی خواب گاہ کے کئی چکر لگا ڈالے، کئی کٹورے پانی کے پی ڈالے، گلوریوں پر گلوریاں نوش کیں۔ پھر بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا ـــــ آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مغرور عورت کا غرور خاک میں ملا دیں گے۔ اسے بتادیں گے کہ بے عزتی کس کو کہتے ہیں۔؟

انھوں نے خوشبودار پانی سے غسل کیا، چُنی ہوئی آستینوں والا کرتا پہنا، لباس کو شمامتہ العنبر میں بسایا، گلابی ڈوروں والی آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھیری، اور اس سج دھج کے ساتھ وہ سیدانی بی کے دالان میں داخل ہوگئے۔

دیواروں میں لگے ہوئے پیتل کے چک دار سہ شاخے میں ایک موم بتی روشن تھی جس کی زرد روشنی میں نواب سکندر مرزا کو سیدانی بی نظر آگئیں۔ ان کا جسم چھت کے قلابے میں رسی کے سہارے جھول رہا تھا۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبل آئی تھیں۔ موت کی اذیت ان کی بھیانک نظر آنے والے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ وہ مرچکی تھیں۔ سکندر مرزا کو مات ہوچکی تھی۔ ایسی مات

جس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے تھے۔

سکندر مرزا وحشت زدہ ہو کر الٹے قدموں وہاں سے لوٹ آئے اور اپنی خواب گاہ میں بند ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ہفتوں نہ سو سکے۔ جب بھی وہ آنکھیں بند کرتے، سیدانی بی کی لاش ان کے سامنے آجاتی۔ انھوں نے سونا چھوڑ دیا۔ جاگتے جاگتے ان کی آنکھیں سُرخ شالباف ہو گئیں۔ ماتھے کی نسیں ابھر آئیں اور پھر ایک دن ان کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ یہ دھند رفتہ رفتہ تاریکی میں بدل گئی اور اس تاریکی میں سارے منظر روپوش ہو گئے۔ اب وہ سوا سیدانی بی کی لاش کے کچھ نہیں دیکھ سکتے تھے، جو مر کر ان کے سامنے اس طرح زندہ ہو گئیں تھیں کہ وہ خود موت کی تمنا کرنے لگے تھے۔

سیدانی بی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ نواب سکندر مرزا کے لیے باقی رہ گیا تھا، وہی نواب سکندر مرزا نے آزمایا۔ سیدانی بی کی خودکشی کے چھ ہفتے بعد نواب سکندر مرزا نے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی حلق میں انڈیل لی، ان کی اچانک موت پر ساری محل سرا حیرت زدہ رہ گئی، سوا خیرن کے جو اس خونیں ڈرامے کی اکیلی تماشائی تھی اور جس کا منھ پیسوں نے نہیں، سیدانی بی کی پاکیزگی اور شرافت نے بند کر دیا تھا۔

دِل ایک سمندر

چھوٹا سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ ناک نقشہ ایسا بے تکا کہ دیکھ کر لگتا تھا کہ فرشتوں نے بڑی بے دلی اور بہت رواروی میں جو چیز جہاں پائی اٹھا کر لگا دی۔

چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھیں، برائے نام ناک، چوڑا سا دہانہ اور اس کے آگے ٹھوڑی کی جگہ گوشت کی ایک ننھی سی بوٹی — اور اس طرح احمد میاں عرف امدو مکمل ہو گئے۔

بارہ تیرہ سال کی عمر تک تو قد و قامت ٹھیک رہا۔ اس کے بعد باڑھ ایسی رکی کہ ساری ورزشیں اور قلابازیاں بے کار ثابت ہوئیں۔ اس کے ساتھ کے لڑکے دیکھتے ہی دیکھتے شائیں شائیں کر کے اوپر نکلتے چلے گئے، اور وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

جب امدو میاں کو ملازمت کے لیے خان صاحب کے سامنے پیش

کیا گیا تو وہ اسے دیکھ کر چکرا گئے۔ بارہ تیرہ سال کے لڑکے کے جسم پر اٹھارہ انیس سال کے لڑکے کا چہرہ لگا ہوا تھا۔ بیچ کے چھ سال کا حساب ان کی سمجھ میں نہ آیا تو سر ہلا کر ملازمت کی اجازت دے دی۔ اس طرح امدو خاں صاحب کے ہاں اوپر کے کام پر ملازم ہو گیا۔

بیگم صاحب کے سامنے جب امدو کی پیشی ہوئی تو پاس بیٹھی ہوئی لڑکیاں اور لڑکے اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ امدو کو زندگی میں پہلی بار ایسی شرم آئی کہ جی چاہا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اپنے گاؤں میں تو کسی نہ کسی طرح نبھ گئی۔ اب ان شہر والوں سے نبھنا مشکل نظر آنے لگا۔ بیگم صاحب نے امدو کو شرمندہ اور افسردہ دیکھا تو سب کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اور بڑی شفقت سے اس سے سوالات کرنے لگیں۔ جب انھیں پتہ چلا کہ امدو کے ماں باپ مر چکے ہیں تو انھیں اس پر ٹوٹ کر رحم آیا اور وہ اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔

" امدو! اب تم اس گھر کو اپنا گھر، اور مجھے اپنی ماں کی جگہ سمجھو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے جھجک مجھ سے کہہ دینا ... ۔ اور ہاں — یہ سارے لڑکے اور لڑکیاں جو کھی کھی، کھی کھی لگا رہے ہیں، چار دن میں سب ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں سب کو سمجھا دوں گی "

بیگم صاحب کی باتیں سن کر امدو کی جان میں جان آئی۔ اس دن سے وہ اس گھر کا ہو کر رہ گیا۔

خان صاحب کے پانچ بچے تھے۔ لڑکے دونوں ابھی چھوٹے ہی تھے اور بلا کے شریر تھے۔ بڑی لڑکی مہرو بہت سنجیدہ اور سمجھدار تھی۔ اس سے چھوٹی تبسم بہت نیک اور سیدھی سادی تھی۔ اور اس کے بعد شازو تھی۔ ایک نمبر کی شوخ اور شریر۔ امدو سب سے زیادہ اس کی شرارتوں کا نشانہ بنتا تھا۔ لیکن اسے سب سے زیادہ شازو ہی اچھی لگتی تھی۔ شازو کی چمکیلی آنکھوں میں شوخی ہی شوخی

بھری تھی۔ پتلے پتلے لب ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ اور اگر کسی وقت وہ خلاف توقع خاموش بھی نظر آتی تو اس وقت دراصل اس کا ذہن کسی نئی شرارت کی اسکیم میں الجھا ہوتا اور ذرا ہی دیر کے بعد امدو اسی نئی شرارت کا شکار ہو جاتا۔

مہرو اور تبسم اس کو بہت سمجھاتیں۔ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتیں۔ لیکن ایسے موقعوں پر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک معصوم سی حیرانی بھر کے سب کو باری باری اس طرح دیکھتی کہ خود امدو ہی اس کی وکالت کرنے پر تیار ہو جاتا۔ حالانکہ اس کے بعد بھی وہ امدو کو ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ اور امدو کو بھی اس کی شرارتوں ہی میں خوشی ملتی تھی۔ اور وہ اپنی ساری تھکن اور کوفت بھول کر مسکرانے لگتا تھا۔

امدو بڑا اچھا ملازم ثابت ہوا۔ صبح سے شام تک گھر کا ڈھیروں کام کر ڈالتا اور جب وہ سارا کام ختم کر کے ذرا آرام کرنے بیٹھتا۔ تو شانو اس کے سر پر سلط ہو جاتی اور جان بوجھ کر الٹے سیدھے کام بتا دیتی۔ جن کو امدو خوشی خوشی انجام دے ڈالتا۔

اس دن گھر میں مہمانوں کی دعوت تھی۔ امدو تھک کر چور ہو رہا تھا۔ کام نپٹا کر ذرا سکون ملا تھا کہ شانو درجن بھر کپڑے استری کرانے پر بضد ہو گئی مہرو نے اسے سمجھایا تو اس نے منہ پھلا لیا۔ امدو کو اس کی خفگی کہاں گوارا تھی۔ جھٹ اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر بولا۔

"بی بی! اداس نہ ہوں۔ بس ابھی فٹافٹ سارے کپڑے استری کیے دیتا ہوں"۔

امدو اپنی ساری تھکن بھول کر استری کرنے لگا۔ شانو کا کام کر کے اسے دلی خوشی ہوتی تھی۔ گھر میں اتنے لوگ تھے۔ ان کے کام کو وہ بس کام سمجھ کر کرتا تھا۔ لیکن شانو کا کام اس کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟

یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

شانو کی سالگرہ تھی۔ وہ ستاروں کے کام کا خوب صورت سا ٹیلاٹ شرارہ اور اسی کا ہم رنگ ستاروں "ٹنکا جھلمل کرتا ڈوپٹہ پہنے تھی جیسے ستاروں سے بھرا نیلا آسمان نیچے جھک آیا ہو اور اسی سے اس کا لباس تیار کیا گیا ہو ـــــ

مہمانوں کے جھرمٹ میں وہ ہنستی مسکراتی اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ اور کلو کام کاج میں مصروف تھا۔ جب بھی اس کی نظر شانو پر پڑتی، وہ اسے اپنی ساری خوبصورتی، دلکشی اور حشر سامانیوں کے ساتھ اپنے دل میں اترتی محسوس ہوتی۔

تھکن سے چور جسم لیے جب وہ رات گئے بستر پر لیٹا تو شانو ایک بار پھر "چھم" سے اس کے خیالوں میں آگئی۔ اور وہ بے اختیار اس کے قدموں سے لپٹ کر بڑبڑانے لگا۔

" شانو بی بی ـــــ میں ـــــ میں ـــــ "

اور پھر اسے ہوش آگیا وہ ابھی یہ کیا کہنے والا تھا۔؟ اس کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔ اپنا چہرہ لہو لہان کر ڈالے۔ اپنے اس بے تکے، بے مصرف جسم کے تین ٹکڑے کرکے ڈال دے۔ اُسے اس کا حق ہی کب تھا کہ وہ شانو سے محبت کرے۔ کہاں آسمان میں چمکنے والا چاند اور کہاں زمین پر رینگنے والا حقیر سا کیڑا ـــــ

اس نے خود کو سمجھانا چاہا۔۔۔۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے شانو اچھی لگتی تھی اور اگر کسی کا اچھا لگنا محبت ہے۔۔۔۔ تو وہ بھی شانو سے محبت کرتا ہے۔ اور پھر اس نے اپنی محبت کو خدمت میں جذب کر دیا وہ شانو کی جی جان سے خدمت کرنے لگا۔ اگر وہ اسے ذرا سا اداس اور پریشان دیکھتا۔ تو پروانے کی طرح بے قرار ہو کر اس کے گرد چکر کاٹنے لگتا ـــــ

ایک بار شانو کو "ٹائیفائیڈ" ہو گیا۔ کلو کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ گھر

کے سارے کام کاج ادھورا کر وہ اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کبھی اس کے ہاتھ پیروں میں جھانوا کر رہا ہے۔ کبھی سر دبا رہا ہے۔ اور کبھی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں پیشانی پر رکھ رہا ہے ـــــ اس کی اتنی خدمت دیکھ کر شانو بھی پسیج گئی۔ امدو کئی راتوں سے جاگ رہا تھا۔ شانو نے بڑی نرمی سے کہا۔

"امدو! تم جاکر سو رہو۔ آپا یہاں لیٹی ہیں۔ کوئی ضرورت ہوئی تو میں ان کو جگا لوں گی"ـــــ

"نہیں بی بی ـــــ مجھے نیند کہاں آتی ہے؟"ـــــ

لیٹو گے تو نیند بھی آجائے گی۔ اس طرح جاگتے رہے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔ پھر میری دیکھ بھال کون کرے گا۔؟"

"آپ اچھی ہو جائیں گی تو خوب جی بھر کے سو لوں گا"ـــــ

شانو نے بحث کرنا فضول سمجھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اور امدو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا ـــــ اور اس کا زرد ستا ہوا چہرہ دیکھ کر کڑھتا رہا۔ اس کا بس نہیں تھا کہ کیسے شانو کا سارا دکھ خود لے لے اور شانو جلدی سے اچھی ہو جائے۔

شانو تندرست ہوئی تو امدو پھر پہلے ہی کی طرح بھاگ بھاگ کر کام کرنے لگا۔ بیگم صاحب نے اسے انعام دینا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ شانو تندرست ہو گئی تھی، یہی اس کا انعام تھا۔ روپے پیسے لینے سے اس کی محبت کی توہین ہوتی تھی ـــــ وہ محبت جو اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی تھی۔ جس کا اظہار وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ راز تو اس کے ساتھ قبر ہی میں جائے گا۔

مہرو اور تبسم کی شادی ہو گئی۔ تو شانو گھر میں اکیلی رہ گئی۔ گھر کے کاموں کی ذمہ داری خود بخود اس کے سر آگئی۔ امدو کی یہی کوشش رہتی تھی کہ شانو پر کسی کام کا بوجھ نہ پڑے۔ سارے کام وہ خود ہی انجام دیتا تھا اور اسے ہاتھ نہ لگانے دیتا تھا۔ شانو کے اجلے ملائم ہاتھ میلے ہوں ـــــ یہ اسے کب گوارا تھا۔

خاں صاحب کے بھتیجے کامران کسی انٹرویو کے سلسلے میں آئے تو ذرا گھر میں چہل پہل ہو گئی۔ شانو بھی ان دنوں بڑی خوش و خرّم رہتی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر امدو بھی ہنستا رہتا اور دوڑ دوڑ کر کام کرتا رہتا۔

ایک دن ڈرائنگ روم میں کامران اور شانو بیٹھے تھے۔ ٹی۔ وی پر کوئی دلچسپ ڈرامہ آرہا تھا ــــ کامران نے امدو سے کافی کی فرمائش کی تو امدو نے پندرہ منٹ میں کافی حاضر کر دی۔

" بھئی امدو میاں، تم ہو بڑے کام کے آدمی۔ جی چاہتا ہے کہ ہم تمھیں اپنے پاس رکھ لیں "ــــ

کامران نے خوش ہو کر کہا ــــ یہ سن کر امدو گھبرا گیا۔ گڑبڑا کر بولا۔

" ارے نہیں بھیا ــــ اس گھر کے سوا میں کہیں نہیں رہ سکتا۔ یہاں سے نکلوں گا تو بس سیدھا قبر ہی میں جا لیٹوں گا۔"

" اگر تمھاری شانو بی بی ہمارے پاس رہنے لگیں تب تو رہو گے ؟"

کامران نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔ امدو کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ وہ بیوقوفوں کی طرح ان کا منھ دیکھنے لگا۔ شانو نے کامران کی بات پر شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کا گلابی چہرہ حیا سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اب امدو کی سمجھ میں ساری بات آگئی ــــ اور "کھٹ" سے کوئی چیز سینے کے اندر ٹوٹ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ہیرو اور تبسّم کی طرح شانو بھی ایک دن اس گھر سے چلی جائے گی۔ پھر وہ کس کے سہارے جیے گا ــــ؟ اس اجاڑ دنیا میں پھر اس کے لیے رہ ہی کیا جائے گا ؟

ایک دن سچ مچ شانو کی برات آگئی۔ کامران میاں دولھا بنے ہوئے کیسے شاندار لگ رہے تھے۔ اونچا سا قد اس پر سجی ہوئی خوبصورت سی شیروانی قدموں تک لوٹتا ہوا سہرا۔ امدو نے انھیں دیکھا تو مارے غصّے کے بُرا حال ہو گیا۔ دل میں رقابت کی آگ دہک اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کامران کا سہرا نوچ ڈالے ان کی چکنی شیروانی تار تار کر ڈالے۔ وہ غصّے سے بھنّایا ہوا جہیز کے کمرہ میں گیا۔

یہاں سے وہاں تک خوبصورت رنگ برنگے ملبوسات سجے ہوئے تھے۔
دیکھ کر اس کی رگ رگ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ دل میں آیا کہ سارے سامان کو آگ لگا دے ۔۔۔۔ یکا یک اس کی نظر سنگار میز کے آئینے پر پڑی۔ وہاں اسے اپنا سراپا نظر آیا۔ ذرا دیر وہ اس میں اپنا عکس دیکھتا رہا۔ سوکھا مارا، بھدّا سا قد۔ اجاڑ صورت۔۔۔ اور پھر جیسے وہ قائل سا ہو گیا۔ اسے صبر آگیا۔۔۔۔۔

کامران میاں، شانو بی بی کیلئے کتنے مناسب ہیں۔ دیکھیں اچھی جوڑی ہے دونوں کی۔ ایک چاند تو دوسرا سورج ۔۔ اور وہ اسی جگہ سجدے میں گر گیا۔ اور گڑ گڑا کر دعا مانگنے لگا۔

" خداوندا! اس چاند سورج کی جوڑی کو سلامت رکھنا۔۔ میری عمر بھی انھیں کو دے دینا۔ دنیا کی ساری خوشیاں ان کے دامن میں بھر دینا۔"
دیر تک وہ سجدے میں پڑا سسکتا رہا۔
رخصتی کے وقت سب عزیز اور رشتے دار شانو کو گلے سے لگا کر رخصت کر رہے تھے۔ اچانک شانو کو امداد کا خیال آگیا۔ اس نے چپکے سے تبسم سے کہا۔
آپا۔۔ امداد کہاں ہے۔۔ اسے بلائیے۔۔
تبسم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ دو چار بچوں سے بھی امداد کو پوچھا۔ لیکن امداد وہاں ہوتا تو نظر آتا۔ وہ تو اس وقت کوٹھی کے پچھواڑے۔ درختوں کے جھنڈ میں بیٹھا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے شانو کو رخصت ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی لئے۔ یہاں آکر چھپ گیا تھا۔
شانو کیا رخصت ہوئی گھر کی رونق ہی ختم ہو گئی۔
امداد کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ وہ ہر دم سہما رہتا

جو بھی کام کرتا بگڑ جاتا۔ جس کے لیئے اسے ڈانٹ بھی کھانا پڑتی تھی۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ یہاں سے چلا جائے لیکن جانے سے فائدہ بھی کیا ہوگا؟۔ شانو کا خیال تو ہر جگہ ساتھ ہی رہے گا۔ یہاں کم از کم یہ آس تو ہے کہ شانو میکے آتی رہے گی۔

شادی کے بعد پہلی بار شانو میکے آئی تو اسکا چہرہ گلاب کی مانند کھلا ہوا تھا۔ امدو اسے دیکھ کر نہال ہوگیا۔ اور پھر وہ وہی پرانا امدو بن گیا۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شانو میکے آتی تو امدو میں برقی رَو سی دوڑ جاتی۔ وہ واپس چلی جاتی تو امدو سست، کاہل اور کام چور بن جاتا۔

اس بار شانو میکے آئی تو خوب تندرست ہو رہی تھی۔ بیگم صاحب ہر وقت اسے نصیحتیں کرتی رہتیں۔ شانو بھی سب سے چھپی اپنے کمرہ میں ننھے ننھے موزے اور ٹوپی بُنا کرتی۔ اور پھر ایک دن وہ اسپتال چلی گئی۔ بیگم صاحب اور امدو بھی سامان سنبھالے اس کے ساتھ ہی گئے۔ شانو تو کسی کمرہ میں بھیج دی گئی۔ وہ اور بیگم صاحب برآمدہ میں حیران اور پریشان سے کھڑے رہ گئے۔

رات کے دو بجے نرس نے تولیے میں لپٹی ہوئی پیاری سی بچی بیگم صاحب کی گود میں دی تو امدو بھی بے اختیار جھک گیا۔ ارے! یہ تو اک دم شانو تھی۔ ننھی منی شانو ــــ اور اس نے بچی کو گود میں لے لیا۔ بیگم صاحب ــــ خان صاحب کو فون کرنے چلی گئیں۔

اب امدو کی مصروفیت اور بڑھ گئی۔ ننھی کے سارے کام وہ خود کرتا تھا۔ شانو کو کسی کام میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا تھا۔ جب کوئی کام نہ ہوتا تو ننھی خوبی کو گود میں لے کر کھلاتا رہتا۔ اس کی موہنی صورت اور معصوم اداؤں میں اسے اپنے دل کا قرار مل گیا تھا۔

کامران بیوی اور بیٹی کو دیکھنے آئے تو امدو کی خدمت دیکھ کر بہت متاثر

ہوئے ۔ جھک کر چپکے سے بیوی سے کہنے لگے۔

شان ڈارلنگ! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ امدو میاں تم کو بہت چاہتے ہیں۔

”وہ تو سب ہی کو چاہتے ہیں ۔ برسوں سے ہمارے پاس ہیں ۔ پھر بے چارے کا ہمارے سوا اور کون ہے ۔؟ ۔

”میرا مطلب ہے کہ امدو میاں کو تم سے عشق ہے ۔ عشق میری نظر دھوکہ نہیں کھا سکتی ۔ شان ڈارلنگ ، مرد اپنے رقیب کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا۔

کامران کی بات سن کر شانو خفا ہو گئی جیسے کسی نے امدو کو گالی دے دی ہو ـــــ اس کی دانست میں یہ امدو کی سراسر توہین تھی۔ اس کی خدمت میں عقیدت کا جذبہ ضرور شامل تھا ۔ لیکن محبت ۔؟ اور پھر جیسے جیسے وہ سوچتی گئی ۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ایک ایک کر کے سارے پردے اٹھتے گئے ۔ اپنی سوچوں کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں پانی چھلک آیا۔

پروردگار! تو نے ایک کمزور اور بے بس انسان پر اتنا بڑا ظلم کیوں ڈھایا ۔۔؟

کیا امدو کے ننھے سے دل میں محبت کا چراغ نہ جلتا تو قیامت آجاتی ؟۔ کون یقین کرے گا کہ اس غریب کا دل ایک سمندر ہے ۔ جس کی گہرائی بے پناہ ہے ۔؟

شانو نے اوپر والے سے جلی ہی دل میں فریاد کی ۔ اسے امدو پر بڑا ترس آرہا تھا ۔

اور پھر شانو چند مہینے کے بعد سسرال چلی گئی ۔ تو امدو کی دنیا میں اندھیرا پہلے اور بڑھ گیا ۔ اس بار اسے شانو کے ساتھ ننھی شوبی کی جدائی بھی تڑپا رہی تھی ۔

خدا جانے یہ امدو کی دعاؤں کا اثر تھا یا اس کے جذبوں کی سچائی کا کرشمہ کہ شانو جلد ہی میکے آگئی ۔ ۔ ہمیشہ کے لئے ۔

امدو نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہنستی مسکراتی شانو کے بجائے اس کے سامنے سفید ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک پتھر کی مورت کھڑی تھی۔ خاموش، گمبھیر اور لٹی لٹی سی۔ سونی کلائیاں۔ اجڑی مانگ میں بیوگی کی راکھ۔ چمکیلی آنکھوں میں شرارت کی جگہ چھلکتے ہوئے آنسو۔ یہ سوگوار سی شانو اس کی شانو نہیں تھی۔

امدو اس کی حالت دیکھ کر خود پہ قابو نہ رکھ سکا اور اس کے قدموں سے لپٹ کر پھپھک اٹھا۔

بی بی۔ کامران میاں کی جگہ میں کیوں نہ مر گیا۔ میری بے مصرف زندگی کس کام کی۔؟

کاش میں اپنی جان کا صدقہ دے کر کامران میاں کو بچا سکتا۔

اس روز کے بعد سے امدو مرجھاتا ہی چلا گیا شانو کے لبوں کی مسکراہٹیں، اس کی شوخیاں۔ اور شرارتیں۔ اس کی آبشاروں کو شرمانے والی ہنسی۔ یہی سب تو امدو کی زندگی تھیں۔ وہ شانو کو اس حال میں کیسے دیکھ سکتا تھا۔؟ اور یوں۔ شانو کے رنڈاپے کا غم امدو کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ اور پھر اس کا کھلا کھلا اور کمزور بیمار ایک دن ڈھے گیا۔ پورا گھر اس کے قریب سمٹ آیا۔ اس کی خدمتوں نے سب کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ شانو بھی اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس نے دھیرے سے پکارا — امدو" — آنکھیں کھولو — امدو"۔

امدو نے اس کی آواز سن کر بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ شانو کو اپنے قریب دیکھا تو آہستہ سے بولا۔

"بی بی۔"

"ہاں امدو۔ میں تمہارے پاس ہوں"

"بی بی — میں۔ میں"

اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو امدو۔؟"

"میں ۔۔ آپ ۔۔ آپ ۔۔ سے :
اور امدو کی زبان بند ہو گئی ۔ اس کی زبان سے لفظ محبّت ادا نہ ہو سکا۔
شانو تڑپ اٹھی ۔

"امدو ۔۔ محبّت کرنے والے اس طرح چھوڑ کر نہیں چلے جاتے ۔ پہلے کامران ۔۔ اور اب تم بھی ۔۔ تم بھی ۔۔ اور شانو اس کے سینے پر سر رکھ کر بلک اٹھی ۔۔
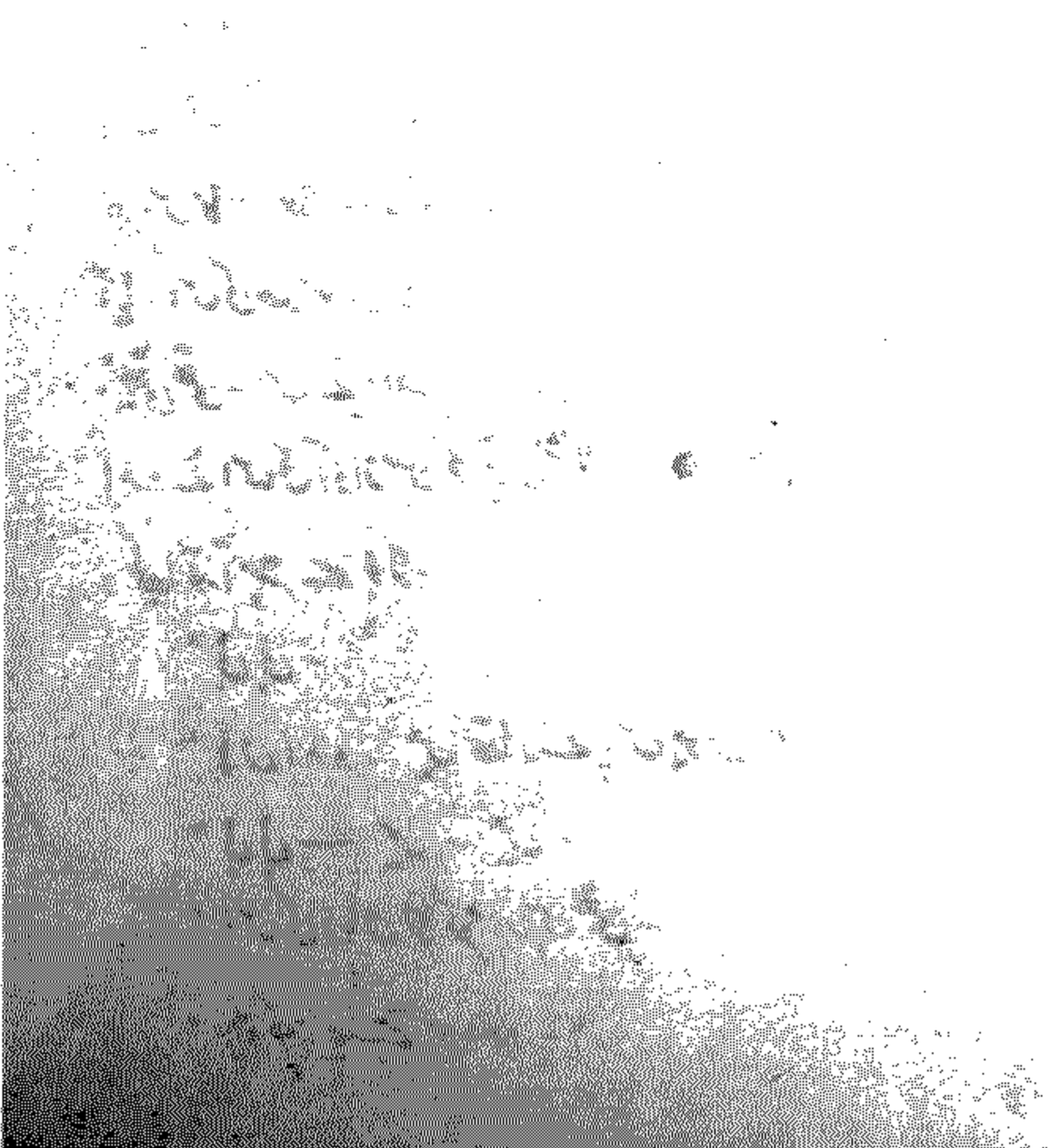
ناگ پھنی

شام ڈھلتی تو حسن ولا کے خوبصورت ایرکنڈیشنڈ بیڈروم میں۔
ڈبل بیڈ کی مسہری پر بچھے یو فوم کے نرم و ملائم گدوں میں ناگ پھنی کے کانٹے
ابھر آتے، اور یہ کانٹے شہلا کے جسم ہی کو نہیں اس کی روح تک کو لہو لہان کر دیتے۔
اور ساری رات ان زخموں سے خون رستا رہتا۔ اور شہلا ان زخموں کی اذیت
سے تڑپتی رہتی۔

بیڈروم سے ملحقہ اسٹڈی روم میں۔ موٹی موٹی کتابوں پر جھکے پروفیسر
حسن کو شہلا کی اس کیفیت کا کوئی علم نہ ہوتا۔ رات ڈھلنے لگتی تو وہ اسٹڈی
سے اٹھ کر بیڈروم میں آتے اور شہلا کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے کبھی فرش
پر بچھے قالین پر اور کبھی دیوان پر لیٹ کر سو جاتے۔ شہلا ان کی اس احتیاط
پر کڑھتی۔ اس کا جی چاہتا کہ پروفیسر حسن، اس کے قریب آئیں اور اپنے ہاتھوں کے
لمس سے ان کانٹوں کو محسوس کریں۔ اور ایک ایک کر کے اس کے جسم میں چبھے ان سارے

کانٹوں کو نکال دیں۔ اور اسے اس کرب ناک اذیت سے چھٹکارا مل جائے۔

باٹنی کے پروفیسر حسن سے اس کی شادی بھی ایک مجبوری کا سودا تھی۔
شہلا کے والد محکمہ آبکاری میں ہیڈ کلرک تھے۔ ہمیشہ رشوت کے پیسوں کے بیچ ان کی شرعی داڑھی حائل ہو جاتی تھی اور حق حلال کی تنخواہ میں چار بیٹیوں اور دو بیٹوں کا خرچ لشتم پشتم پورا ہوتا۔ پورا بھی کب ہوتا تھا۔ ہر ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ ہر آرزو ادھوری رہ جاتی۔ چار جوان اور خوبصورت بیٹیوں کے بوجھ سے والد صاحب کے کاندھے جھک گئے۔ کمر خمیدہ ہو گئی۔ اور ایسے میں شہلا کے لیے جو رشتے آئے ان میں پروفیسر حسن کو چھوڑ کر سب کے ساتھ جہیز کی لمبی چوڑی فہرست اور نقد روپیوں کا تقاضہ کچھ اس طرح جڑا ہوا تھا کہ انھیں مجبوراً حسن کا انتخاب کرنا پڑا اور باٹنی کے پروفیسر کو اپنے گلستاں کا سب سے حسین پھول سونپ کر اطمینان کی سانس لی۔ اپنی مجبوریوں میں انھیں پروفیسر کی 'کچھ زیادہ' عمر کا حساب رکھنے کا دھیان بھی نہ آیا۔

'حسن ولا' میں اس کا استقبال ناگ پھنی کی گھنی جھاڑیوں نے کیا۔ یہ جھاڑیاں بنگلے کے داخلی گیٹ سے شروع ہو کر پچھلی دیوار تک چلی گئی تھیں۔ وہ بنگلے کی حفاظت کے لیے کانٹوں کی دیوار سی کھڑی ہو گئی تھی۔ لیکن جب ناگ پھنی کے کانٹے نرم گدیلے بستر میں اگنے لگے تو شہلا تڑپ اٹھی۔

پروفیسر حسن کا پروگرام صبح سے شام اور شام سے رات تک کچھ ایسا سیٹ (Set) تھا کہ اس میں شہلا کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پروفیسر بھی شہلا کو بس اسی طرح حسن ولا میں لے آئے تھے جیسے ان کے بنگلے میں متعدد خوبصورت پودے اور پھول تھے۔ جن کو انھوں نے گاہے گاہے لا کر اپنے گھر کی زینت بنایا تھا۔ لیکن شہلا محض ایک پودا نہیں تھی۔ جسے کھاد اور پانی دے کر مالی کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ اس کی جیتی جاگتی سانسوں کو توان لمحوں کی ضرورت تھی۔ جو اس کے وجود کی ساری خوشبو کو اپنے اندر جذب کر لیں۔

ایک صبح ناشتے کی میز پر پروفیسر حسن نے کہا

"شہلا! ایک کمرہ درست کر دو میرے مربّی و محسن پروفیسر ڈاکٹر شیرازی کا لڑکا منظر کچھ دن یہاں ٹھہرنے والا ہے۔ اس کا ٹرانسفر یہیں ہو گیا ہے۔ محکمہ کی طرف سے بنگلہ ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس لیے ــــ"

"بہتر ہے" ــــ شہلا نے جلدی سے کہا اور بیزاری سے ٹوسٹ پر جیلی لگانے لگی۔ اسے پروفیسر کے جہان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ جب می بی اور محسن کا شاگرد اس قدر بور ہے ــــ اس کا لڑکا کتنا ناقابلِ برداشت ہو گا ــ" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

شام کی چائے پر پروفیسر حسن نے اس کا تعارف منظر شیرازی سے کرایا۔ منظر نے اسے سلام کرکے شوخ لہجہ میں کہا۔

"بھائی صاحب! ہماری بھابی سچ مچ اس لائق ہیں کہ ان کے لیے سارے اصول توڑ ڈالے جائیں۔ اس شادی کے لیے قصوروار آپ نہیں ــــ بلکہ بھابی ہیں ــ"

پروفیسر حسن مسکرا دیئے۔ لیکن کچھ بولے نہیں ــ

"ہاں ــ یہ ضرور ہے کہ آپ نے 'باغی' سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور گلشن کا سب سے حسین شاداب پھول منتخب کر لیا،، ــــ

شہلا اس بیباک تعریف پر شرما گئی۔ امید کے خلاف یہ صاحب، تو کافی تیز و طرار نکلے تھے ــــ

منظر، بہت خوش مزاج اور زندہ دل نوجوان تھا۔ شہلا کو بھی 'حسن والا' کی پھیکی اور بد مزہ زندگی سے تھوڑی بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ــ اور رات میں جب وہ سونے لیٹتی ــــ تو بستر میں اُگے کانٹے سر نہ اٹھاتے ــ اور وہ لیٹی ہوئی دن بھر کے چھوٹے بڑے واقعات کو یاد کرتی رہتی ــ منظر کی دلچسپ باتیں۔ شوخ فقرے اور کبھی کبھی اس کی بے تکلفی والی ادائیں یاد آکر گدگدا دیتیں

رات دبے پاؤں گزرتی رہتی اور صبح کے انتظار میں کچھ اس طرح بیت جاتی کہ اسے رات سے کوئی گلا اور شکوہ نہ ہوتا۔

"بھابھی پلیز ——— ذرا میری قمیض میں بٹن ٹانک دیجئے۔ منظر نے قمیض شہلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ شہلا نے بٹن ٹانک کر قمیض واپس کی تو وہ شرارت سے کہنے لگا۔"

"یہاں تو قدم قدم پر مجھے آپ کی ضرورت پڑتی ہے سوچتا ہوں یہاں سے چلا گیا تو میرا کیا بنے گا" ؟ ——

"میری مانیے تو شادی کر ڈالیے۔ بنگلے کے ساتھ ساتھ دل بھی آباد کر لیجئے ——— خانہ ویرانی کا احساس ختم ہو جائے گا۔"

"آپ بڑے غلط وقت پر مشورہ دے رہی ہیں۔"

"وہ کیسے ؟" شہلا الجھ کر بولی ——

"وہ ایسے کہ آپ کے گھر حقوق تو پہلے ہی کسی کے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ خانہ ویرانی تو اب میرا مقدر بن چکی ہے۔"

منظر نے افسردہ لہجہ میں کہا ——

"شہلا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ——— جلدی سے کمرہ سے نکل گئی ——— اور پھر بستر پہ منھ اوندھا کر لیٹ رہی۔ کانٹوں نے اسے کمزور پا کر سر اٹھایا ——————— ایک ایک کر کے ڈھیروں خونخوار اور نوکیلے کانٹے۔ اس کے جسم کو چھیدنے لگے۔ اسے ان ہاتھوں کی ضرورت کا احساس شدت سے تڑپانے لگا۔ جو اسے اس اذیت سے نجات دلا دیں۔

اب ہر رات اس کے خوابوں اور خیالوں میں منظر در آتا ——— وہ خود کو اس سے قریب، بہت قریب محسوس کرتی ——— یہ قربت ذہنی تھی ورنہ ان کے درمیان اخلاقی حدیں بدستور قائم تھیں ——— اور شہلا اس کو دولت فراواں سمجھتی تھی کہ چپکے چپکے کسی کے بارے میں سوچا جائے ——— اور تصور

کی دنیاں اس طرح آباد رہے ۔ کہ تشنگی کا احساس ختم ہو جائے ۔ اس میں کسی گناہ کا احساس بھی نہیں ہوتا ۔ اور بوند بوند کر کے پیاس بھی بجھتی رہتی ہے ۔ وہ یہ بھول گئی کہ جب قطرہ قطرہ مل کر سمندر بن جائے گا۔ تو کیا ہو گا ؟ ۔

رات کے کھانے کے بعد کافی کا دور چلا ۔ حسب معمول پروفیسر اپنی کافی ختم کر کے انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے اسٹڈی روم میں چلے گئے ۔ وہ دونوں وہیں ڈرائینگ روم میں بیٹھے رہے ۔ منظر دھیرے دھیرے کافی پی رہا تھا اور شوخ نظروں سے شہلا کو دیکھ رہا تھا جو بڑے انہاک سے سوئیٹر بن رہی تھی ۔ وہ اس کو دیکھتا رہا ۔ پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر سلائی کھینچ لی ۔ سارے پھندے اتر گئے ۔

" یہ کون سی شرارت ہے آپ کی ۔ سارا ڈیزائن غلط ہو جائے گا ۔" شہلا نے خفگی سے کہا ۔

" اوں ہوں ۔ اس کو الگ رکھیے اور باتیں کیجیے ۔"
منظر نے سوئیٹر اس کے ہاتھ سے لے کر الگ رکھ دیا ۔

" ٹھیک ہے نہیں بنوں گی ۔ اب میں سونے جا رہی ہوں ۔ شب بخیر ۔"

شہلا اٹھنے لگی تو منظر نے اسے کاندھوں سے تھام کر بٹھا دیا "

" آخر آپ کیوں اپنے آپ پر ظلم کرنے پر تلی ہوئی ہیں ۔ پروفیسر صاحب تو اسٹڈی روم میں جا چکے ہیں ۔ اب وہ دو تین بجے سے پہلے نہیں آئیں گے ۔ پھر آپ وہاں تنہا کیا کریں گی ؟ " ۔

" منظر ۔ آپ بھی کیا فضول باتیں لے بیٹھے ۔"

" شہلا مجھے تمہارے اوپر بڑا ترس آتا ہے ۔ تمہارا حسن و شباب اس لیے نہیں ہے کہ تم ساری رات شمع کی مانند پگھلتی رہو ۔"

"قسمت کا لکھا پورا ہوا منظر — اب اس سے فرار ناممکن ہے" شہلا نے دھیمی آواز میں کہا —

"یہ تمھاری بزدلی ہے۔ کم عقلی ہے۔"

"پھر میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟"

"تم چاہو تو سب کچھ کر سکتی ہو۔ جب پروفیسر کو تمھارا کوئی خیال نہیں ہے تو تم کیوں اپنی زندگی کو صحرا بنانے پر تلی ہو؟"

"اس صحرا کو نخلستان میں بدلنا میرے امکان میں نہیں ہے۔"

"ذرا نظر اٹھا کے دیکھو — کتنی مست بہاریں تمھیں گلے لگانے کو بیچین ہیں — ؟" شہلا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں شہلا! میں سچ کہہ رہا ہوں — اُدھر تم کانٹوں پر رات بسر کرتی ہو۔ اِدھر میں انگاروں پر لوٹتا ہوں، تمھاری یاد میں رات کا ہر پل — ایک صدی بن کر گذرتا ہے۔ اور وقت کے بے رحم ہاتھ تم کو بھی برہا کے شعلوں کے حوالہ کر کے ایک ایک لمحہ کا حساب چکاتے ہیں۔"

شہلا کا سارا وجود سلگ اٹھا۔ منظر نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ احساس میں ناگ پھنی کے وہ کانٹے چبھنے لگے۔ جو ہر رات بستر میں اگ آتے تھے۔ اور اسے لہو لہان کر دیتے تھے۔

منظر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ شہلا اپنے جذبات کے طوفان میں گھری ہوئی تھی — مدافعت کا خیال ہی نہ آیا اور منظر نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا — اور پھر اس کی گرم گرم سانسیں شہلا کے لبوں سے ٹکرانے لگیں۔ شہلا جذبات کے بھنور سے باہر نکل آئی اور وہ گرم گرم سانسیں اسے ایک خطرناک زہریلے اژدہے کی پھنکار معلوم ہونے لگیں۔

"منظر" اس نے سخت لیکن دھیمی آواز میں احتجاج کیا۔ لیکن منظر کو یہ احتجاج بہت کمزور لگا اور وہ اسے بے تحاشا چومنے لگا۔ یکایک ناگ پھنی

کے کانٹے شہلا کے سارے جسم میں اگ گئے ۔ اور وہ عورت نہ رہ کر ناگ پھنی کا پودا بن گئی ۔ اس نے منظر کو جھکا ہوا چہرہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے نوچ کر لہو لہان کر دیا منظر کی گرفت کمزور ہو گئی ۔ اور وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی ۔ اور اپنے بیڈ روم میں بند ہو گئی ۔

صبح ناشتہ کی میز پر منظر غائب تھا ۔ پروفیسر حسن نے ملازم کے ذریعہ اس کو بلوایا ۔ وہ آیا ۔ لیکن ہاتھوں میں سوٹ کیس لیے ہوئے ۔ شاید کہیں باہر جانے کی تیاری تھی .....

" ارے منظر ! ـــ یہ صبح صبح کہاں چل دیے ۔ اور یہ تمھارے چہرے پر زخم کیسے ہیں ؟ ـــ پروفیسر حسن نے پوچھا ـــ

" یہ کل رات ناگ پھنی کی جھاڑی سے الجھ کر زخمی ہو گئے تھے ۔ لہٰذا اب ایسی جگہ جا کر رہیں گے ـــ جہاں یہ خار دار پودے نہ ہوں ـــ
شہلا نے جل کر کہا ـــ لیکن منظر نے اس کے طنز کو نظر انداز کر دیا اور پروفیسر سے کہنے لگا ۔

" مجھے بنگلہ مل گیا ہے ۔ اس لیے یہاں سے جا رہا ہوں "

" اچھا ! بڑی خوشی ہوئی کبھی کبھار آتے رہنا ـــ " منظر انھیں سلام کر کے چلا گیا ۔ شہلا اطمینان سے ناشتہ کرتی رہی ۔

رات میں پروفیسر حسن نے جیسے ہی اسٹڈی روم کی طرف قدم بڑھائے ۔ شہلا نے ان کا ہاتھ تھام لیا ـــ پروفیسر حسن اس کی اس ادا پر مسکرائے اور اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیے ۔ اور ناگ پھنی کے نوکیلے کانٹے اس کے بستر ہی سے نہیں ـــ اس کی زندگی سے بھی اس طرح غائب ہو گئے ۔ جیسے ان کا کبھی کوئی وجود ہی نہ رہا ہو ۔

اللہ تیری قدرت

نوری بیچوں بیچ ڈیوڑھی میں گھبرائی ہوئی سی کھڑی تھی۔ اندھیروں سے اچانک جگ مگ کرتی روشنی میں آجانے سے وہ بوکھلا سی گئی تھی۔ جیسے روشنیوں کے عادی اچانک بجلی کا فیوز اڑ جانے سے بوکھلا اٹھتے ہیں۔

اپنی پرانی ملگجی چادر کو جسم کے چاروں طرف اچھی طرح پیٹے، المونیم کے برتنوں کو کپڑے میں چھپائے وہ اندھیری گلی پار کر کے یہاں تک آتو گئی تھی۔ لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔؟

آج وہ پہلی بار گھر سے باہر نکلی تھی۔ وہ بھی بچوں کی خاطر۔ ننھے ننھے بچے دو وقت کے فاقے سے تھے۔ اور مولوی فراست علی جو خدا کے رزق دینے کے وعدے کو ایمان کا حصّہ سمجھتے تھے، بغیر ہاتھ پیر ہلائے اس رزق کے منتظر رہتے تھے: انھیں اپنے ہاتھ پیروں سے زیادہ خدائے رحیم کے وعدے پر بھروسہ تھا۔ جو وعدہ پورا تو کرتا تھا، لیکن کبھی کبھی بھول بھی جاتا تھا۔ اور اس کی اسر:

بھول کا خمیازہ معصوم بچوں کو بھگتنا پڑتا تھا۔ نوری کو اپنی تو زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی، لیکن بچوں کا تڑپنا اس سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے آج جب ہمسائی نے بتایا کہ نکڑ والی حویلی کے رئیس کا چالیسواں ہے اور ان کے صاحبزادے آصف میاں نے محتاجوں اور غریبوں کے لیے عام دعوت کا انتظام کیا ہے تو وہ ضبط نہ کر سکی اور بچوں کو سلا کر بے حیا بن کر کھانا لینے چلی آئی۔ مولوی فراست علی تو عشاء کی نماز کے بعد دیر تک عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ نوری نے سوچا کہ اتنے میں وہ کھانا لے کر واپس چلی آئے گی۔

حویلی میں سناٹا تھا۔ لوگ کھانی کر جا چکے تھے اب وہاں روشنی کے جھماکوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا ___ نوری مایوس ہو کر لوٹنے کو ہی تھی کہ اندر سے آصف میاں نکل آئے۔ نوری نے جلدی سے گھونگھٹ کھینچ لیا۔ آصف میاں اتنی رات گئے ایک عورت کو اپنی ڈیوڑھی میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"کیا بات ہے؟" ___

انھوں نے دریافت کیا۔ وہ خاموش رہی پھر شاید ان کی نظر نوری کے ہاتھ میں دبے ہوئے برتنوں پر پڑی اور انھوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔ نرمی سے مسکرا کر بولے ___

"کھانا لینے آئی ہو؟" ___

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرے ساتھ آؤ" ___ انھوں نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ پچھلے دالان میں دیگیں رکھی تھیں ___ سارا دالان پلاؤ اور زردے کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ نوری کو اپنے گھر کی خالی ہانڈیاں یاد آگئیں۔

"تم خود ہی کھانا نکال لو" ___ انھوں نے کہا۔ نوری کچھ اور سمٹ گئی۔ اسے حوصلہ نہ ہوا کہ بڑھ کر کھانا نکال لے۔ اس کی جھجک دیکھ کر آصف میاں

نے اس کے ہاتھ سے برتن لے لیے اور خود ہی کھانا نکالنے لگے۔ انھیں اس سہمی سہمی عورت پر بڑا ترس آرہا تھا۔ برتن سنبھال کر وہ ان کی رہبری میں باہر آگئی۔ شرم سے اس کے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرے، جس نے اس کے بچوں کے لیے اتنا کھانا دے دیا ہے کہ کم از کم دو دن تک وہ آرام سے کھا سکتے ہیں۔ لیکن وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی، حلق میں آنسوؤں کا پھندہ سا پڑ گیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر اس نے کچھ کہنا بھی چاہا تو نہیں کہہ سکے گی۔ کیوں کہ آواز کی بجائے آنسو نکل آئیں گے۔

"کیا تم اکیلی ہی آئی ہو۔؟"

اس کے ساتھ کسی کو نہ دیکھ کر آصف میاں نے سوال کیا۔

"جی ـــ" بہ مشکل تمام اس نے آہستہ سے کہا۔

"کہاں رہتی ہو؟" ـــ انھوں نے ہمدردی سے پوچھا ـــ

....

"اندھیری گلی میں" ـــ

تھرتھراتی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا ـــ دراصل اب وہ اپنے اس طرح، اتنی رات کو تنہا چلے آنے پر شرمسار ہو رہی تھی۔ خدا جانے وہ اس کے متعلق کیا خیال کریں گے؟

"اس وقت تمھارا تنہا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ چلو میں تم کو پہنچا دوں۔ ملازم کو جگا کر بھیجوں گا تو مجھے بے اطمینانی رہے گی۔"

آصف میاں، ذرا سے چند قدم پیچھے رہ کر چلنے لگے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ رئیس زادے ہو کر بھی کتنے رحم دل ہیں۔ اس کے لیے تو وہ سچ مچ ہی فرشتۂ رحمت بن گئے۔ ایک طرح وہ خود بھی اس وقت مولوی صاحب کے عقیدہ کی قائل ہو گئی تھی ورنہ یوں بے سان و گمان کیسے بچوں کے لیے کھانے کا انتظام ہو جاتا ـــ

"اللہ تیری قدرت کے صدقے۔"

نوری نے جی ہی جی میں کہا —

اپنے گھر کے دروازہ پر پہنچ کر نوری نے مڑ کر دیکھا۔ آصف میاں واپس جا رہے تھے۔ احسان مندی کے جذبے سے اس کا جی بھر آیا، اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دعائیہ کلمے اس کے لبوں پر مچل اٹھے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گھر میں داخل ہوتی، پیچھے سے مولوی صاحب کی کرخت آواز آئی۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟ — کون تھا وہ آدمی؟" —

"میں — میں —" نوری ہکلانے لگی۔ مولوی صاحب اس کا ہاتھ گھسیٹ کر اندر لے گئے۔ نوری کے دل میں احساس جرم کی رمق تک نہیں تھی۔ بس وہ اچانک انھیں سر پر دیکھ کر گھبرا گئی تھی اور اس لیے بھی کہ مولوی صاحب ایک مرد کو اس کے ساتھ دیکھ کر خدا جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ اسے خیال آیا تو اس نے جلدی سے کھانے کی پوٹلی آگے کر دی۔ یہ ہی اس کی بے گناہی کا ثبوت تھا۔

"جی میں بچوں کے لیے کھانا لینے گئی تھی، نکڑ والی حویلی میں رئیس کا چالیسواں تھا۔ گلی محلے کے سب لوگ کھانا لائے تھے۔ ہمسائی نے بتایا تو میں بھی چلی گئی۔ مجھے معاف کر دیجئے"

سچ مچ وہ اپنی غلطی پر پشیمان تھی۔

"اس حرام کے رزق سے تم میرے بچوں کا پیٹ بھرو گی"۔

مولوی صاحب شیر کی مانند دھاڑے اور کھانے کی پوٹلی اس کے ہاتھ سے لے کر پھینک دی — نوری کھانے کی یہ درگت دیکھ کر تڑپ گئی۔

"یہ — یہ حرام کا نہیں ہے"۔

نوری نے احتجاج کیا۔ اسے اپنے بچوں کا بھوک سے بلکنا یاد آ گیا۔ کیا یہ معصوم بچے حرام و حلال کے فلسفے سے مطمئن ہوں گے؟"

"خاموش رہ بدذات!"—

مولوی صاحب چلّائے اور تڑاخ سے ایک بھرپور ہاتھ اس کے گال پر جڑ دیا — نوری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا - وہ دالان کے ستون سے ٹکرا گئی - اُسے چوٹ کا احساس کم، مولوی صاحب کے زہر آلود الفاظ کا اثر زیادہ تھا - وہ انھیں کیسے سمجھائے کہ وہ اس وقت عورت نہیں صرف ماں ہے -

" اپنی صورت اور جوانی دکھا کر تو جو کھانا لائی ہے وہ - وہ حرام ہے — ورنہ وہ تیرے ساتھ کیوں آیا تھا ؟

" خدا کے لیے یہ نہ کہیے - وہ بے چارے بھلے مانس تو مجھے اکیلا دیکھ کر ہمدردی میں پہنچانے چلے آئے تھے - میرے بچّوں کے لیے انھوں نے کھانا دیا یہ" ان کا احسان ہے - میرے بچّے دو دو وقت فاقہ کرتے ہیں اور آپ اس رزق کا آسرا دکھا کرتے ہیں - جس کا وعدہ آپ کے خدا نے آپ سے کیا ہے - لیکن ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر وہ کسی کو نہیں دیتا - میں ماں ہوں — اپنے بچّوں کو بھوک سے تڑپتے نہیں دیکھ سکتی - بس میرا یہی قصور ہے "—

نوری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - اس وقت بے زبان نوری کے منھ میں نہ جانے کہاں سے زبان آگئی تھی - اس کی باتوں سے مولوی صاحب قائل ہونے کے بجائے اور بھڑک اٹھے - منھ سے کف نکالتے ہوئے دھاڑے -

"کان کھول کر سن لو - غیر مرد کا سایہ پڑنے کے بعد اب تم بھی مجھ پر حرام ہو چکی ہو — میں نے تمھیں طلاق دی - طلاق دی - طلاق دی -"

"نہیں نہیں — اتنا ظلم نہ کیجیے"—

نوری ان کے پیروں پر گر گئی - میں یہ کھانا پھینک دوں گی - میں بچّوں کو بھوکا رہنے دوں گی - مجھے معاف کر دیجیے - مجھے معاف کر دیجیے"!

"طلاق کے بعد اب میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں رہا"۔ مولوی صاحب نے بڑے رعب و جلال سے کہا۔ اور گھر کے باہر نکل گئے۔ اتنا بڑا فیصلہ انھوں نے اس قدر آسانی سے کر دیا تھا۔ جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔ روز کا معمول ہو ـــ

دونوں بچے اس چیخ و پکار سے جاگ اٹھے تھے۔ اور اب ماں کے ساتھ وہ بھی رو رہے تھے۔ کھانے کی پوٹلی ایک طرف لڑھکی پڑی تھی۔ لیکن نوری کو تو اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ بچوں کو چپ ہی کرا دے۔ ہر احساس ختم ہو گیا تھا۔ بس اپنی بربادی کا احساس رہ گیا تھا۔

ایک ہفتے سے مولوی صاحب گھر نہیں آئے تھے۔ وہ مسجد کے حجرے میں رہ رہے تھے۔ اور اب یہ بات سارے محلے میں مشہور ہو چکی تھی کہ مولوی صاحب نے نوری کو طلاق دے دی ہے ـــ اور یہ کہ وہ بدچلن اور آوارہ ہے ـــ نوری اپنی اس ذلت اور بربادی پر رو رو کر جان دیئے دے رہی تھی۔ لیکن اس کے آنسو پوچھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ تو اس وقت کو کوس رہی تھی، جب وہ حویلی گئی تھی ـــ

ایک روز سرِ شام کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے پہلے ہی یقین تھا کہ خدا رحیم و کریم ہے۔ مولوی صاحب ضرور گھر واپس آ جائیں گے۔ اپنی دعاؤں کی قبولیت پر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اور وہ بے تحاشا دروازہ کی طرف دوڑی ـــ دروازہ کھولا تو سامنے آصف میاں کھڑے تھے۔ اس نے سر پر دوپٹہ برابر کیا اور دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آصف میاں ایک پل میں اس کی حالت دیکھ چکے تھے۔ دوسری طرف نوری ان کو دیکھ کر اور زیادہ پریشان ہو گئی تھی ـــ

"تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟" ـــ

آصف میاں نے آہستہ سے پوچھا ــــ وہ خود بھی چور سے تھے۔

" خدا کے لیے آپ چلے جائیے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا"۔ نوری نے لجاجت سے کہا۔ ان کی اس روز کی ہمدردی کا خمیازہ تو وہ آج تک بھگت رہی تھی ــــ وہ سسک اٹھی۔

" تو میں۔ میں نے جو کچھ سُنا ہے۔ وہ سچ ہے؟"

نوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس روتی رہی۔

" میں اپنی اس دن کی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں ــــ یقین مانو جس وقت سے سُنا ہے میرا سارا سکون ختم ہوگیا ہے"۔

آصف میاں شرمسار اور پشیمان سے تھے۔

" تم میرے ساتھ چلو ــــ یہاں رو رو کر جان دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ گناہ و ثواب کا حساب مولوی صاحب نہیں کریں گے۔ وہ تو وہی کرے گا ــــ جو سب کا مالک ہے"۔

نوری کی سسکیاں شدت اختیار کر گئیں تو آصف میاں بے اختیار اندر آگئے۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک مرد کے پورے وقار کے ساتھ بولے۔

" مجھ پر بھروسہ رکھو نوری، ہر مرد کو مولوی فراست علی نہ سمجھو"۔

آصف میاں نے منّے کو گود میں اٹھا لیا۔ پپّو کی انگلی پکڑ کر نوری کا ہاتھ تھاما ــــ اور باہر نکل آئے۔

ان کی گاڑی اندھیری گلی پار کر کے اجالوں میں آئی تو نوری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مولوی فراست علی کے حرام و حلال کے فلسفے نے اسے ان اجالوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اندھیروں کو تو اس نے اپنا مقدر سمجھ کو قبول کیا تھا، لیکن یہ اجالے اس کی مجبوری تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ مولوی فراست علی اپنے حجرے میں لیٹے ہوئے تھے۔

ملازم نے کھانے کی سینی چوکی پہ رکھ کر انھیں آواز دی۔

"مولوی صاحب کھانا کھا لیجئے"۔۔۔۔

"کہاں سے لائے ہو بھائی؟"۔۔

" انھوں نے ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔

"نکڑ والی حویلی سے بیگم صاحبہ نے بھجوایا ہے۔ اب آپ کا دونوں وقت کا کھانا حویلی سے آئے گا"۔۔

ملازم نے کہا۔ مولوی فراست علی چونک پڑے۔

"بیگم صاحبہ۔۔؟ یعنی۔۔ یعنی ان کی بیوی نوری؟ لاحول ولا قوۃ۔ طلاق کے بعد وہ ان کی بیوی کہاں رہی"؟

مولوی صاحب نے سرپوش ہٹایا۔۔۔ بسم اللہ، کہہ کر بریانی کا بڑا سا نوالہ دہن مبارک کی نذر کیا۔۔۔ اور جی ہی جی میں کہا۔

"شکر ہے تیرا۔۔ تو ہی رزق دینے والا ہے"۔۔۔

بوڑھا یوکلپٹس

حویلی کے پیچھے کشادہ اور صاف ستھرے آنگن کے بیچ میں یوکلپٹس سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کا اونچا چکنا اور سفید تنا ــــ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اور پتلی پتلی شاخوں میں پروئے ہوئے نرم نرم پتے، نیچے کی طرف جھکے ہوئے، ہوا کی شفیق تھپکیوں کی تال پر ادھر سے اُدھر لہرا رہے تھے۔ جیسے کوئی معصوم بچہ پالنے میں پڑا جھول رہا ہو۔ یہ یوکلپٹس جیسے صدیوں سے اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کی آغوش میں ہی حویلی نے زمانے کے بہت سارے گرم و سرد دیکھے۔ کتنے انقلاب آئے۔ کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ اور یہ بوڑھا یوکلپٹس، ان کے رازوں کا امین ــ ان کے دکھ سکھ کا ساتھی، ان کا غمگسار بن گیا۔

سیّدوں کی گڑھی ــــ اور گڑھی کے مالکان زمینداری ختم ہونے کے بعد ایک داستانِ پارینہ بن جاتے ـــ اگر انھوں نے وقت کے تقاضوں کو نہ سمجھ

کیا ہوتا — وہ حویلی سے نکل کر دور دور پھیل گئے۔ کسی نے کاروبار کیا۔ کسی نے ملازمت کی۔ وقت اور حالات نے انھیں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن وہ وقت وقت سے حویلی میں جمع ہوتے تھے اور باہم بیٹھ کر اسی طرح بے فکری سے قہقہے لگاتے تھے جیسے اپنی بے فکری کے زمانے میں قہقہے لگاتے تھے۔ خاندان کی کوئی بھی شادی یا غمی — انھیں پھر یکجا کر دیتی تھی۔ حویلی کی گہما گہمی دیکھ کر بوڑھا یوکلپٹس بھی خوش ہوجاتا تھا۔

اکتوبر کی خنک سی شام تھی۔ حویلی میں اندر سے باہر تک مسرتوں کا راج تھا۔ باہر لمبے لمبے دالانوں میں خاندان کے مرد جمع تھے۔ ملازموں کو احکام دیئے جا رہے تھے۔ برات کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ روے، شکر، میوے اور چاول کے بورے، گھی کے کنستر ایک دالان میں رکھے تھے۔ باورچی اپنی نگرانی میں تنور گڑوا رہے تھے۔ حویلی کے اندر وسیع دالانوں اور کشادہ صحنچیوں میں خواتین کی حکومت تھی۔ تختوں کے چوکوں پر چاندنیوں کا فرش تھا۔ خاندان کی بزرگ خواتین گاؤتکیے کے سہارے بیٹھی تبادلۂ خیال کر رہی تھیں۔ دوسرے دالان میں خوش رنگ جازم کا فرش تھا۔ ڈھیروں ملبوس، گوٹہ، لچکا، بانکڑی اور بنت سلیقے سے رکھے تھے۔ اور سگھڑ بیویاں ٹنکائی اور سلائی کے کام میں الجھی ہوئی تھیں۔ بیچ والے چھوٹے مکان میں ایک کشادہ کمرے میں زہرہ مانجھے بیٹھی تھی۔ اور سب لڑکیاں یہاں جمع تھیں۔ بزرگوں کی تنبیہی نظروں سے دور وہ یہاں بیٹھی۔ آزادی سے شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ اور ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔

ملیحہ زہرہ کے پاس بیٹھی تھی۔ اور سب کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ اس کے ہوش میں ننھیال کی پہلی شادی تھی۔ اور زہرہ اس کی خالہ زاد بہن تھی۔ پہلے بھی کئی بار وہ اماں کے ساتھ لکھنؤ آچکی تھی۔ لیکن اس بار تو لطف ہی کچھ اور تھا۔ دور قریب کے سارے عزیز اکٹھا تھے۔ کتنے تو ایسے تھے جنھیں اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

مریم نے جھک کر ملیحہ کے کان میں سرگوشی کی" ملیحہ — اوپر چل کر ذرا دیر آرام کر لو۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوگی"

" نہیں — مجھے تو اچھا لگ رہا ہے"۔

مریم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں اوپر چلی گئیں۔ مریم کے مختصر سے کمرہ میں بہت سکون تھا۔ ملیحہ کو۔ یہاں آکر سچ مچ تھکن کا احساس ہونے لگا۔ وہ لیٹ گئی۔ نادان کی لڑکی پیالے میں پسی ہوئی مہندی دے گئی۔ مریم نے ضد کر کے اس کے ہاتھوں پر خوبصورت نقش و نگار بنا دیئے۔ دو گھنٹے کی نیند کے بعد جب وہ بیدار ہوئی تو مہندی سوکھ کر ادھر ادھر بکھر گئی تھی۔ اس نے ہاتھ دھو کر مریم کے سامنے پھیلائے.... دودھ جیسی ہتھیلیوں پر سرخ سرخ پھول اور پتیاں ابھر آئی تھیں۔ وہ شرما گئی۔

مریم — مہندی تو بہت خوبصورت لگائی ہے"— آواز پر اس نے سر اٹھایا تو اس کی نظریں شربتی آنکھوں سے ٹکرا گئیں۔

——— دوسرے پل اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔

" آیئے احمر بھائی "— مریم نے تپاک سے کہا۔

" بیٹھیے نا "—

ملیحہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ دونوں ہاتھ دوپٹے میں چھپا لیے۔ احمر اس کے سامنے ہی بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ اور اپنی شربتی آنکھوں میں شوخی لیے اسے دیکھے جا رہے تھے۔

" یہ ملیحہ ہیں۔ شاہدہ پھپھو کی لڑکی — شہر میں رہتی ہیں" مریم نے تعارف کرایا۔ وہ "خوب" کہہ کر مسکراتے رہے۔

" مریم پانی ملے گا "— احمر نے آہستہ سے کہا۔

" ابھی لائی "— مریم باہر نکلی اور ملیحہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

" ملیحہ — آپ کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں "

احمر نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"گستاخی معاف کیجیے گا!۔ تعریف کا یہ انداز شاید آپ کو پسند نہ آئے۔ لیکن ——"۔

اور دوسرے پل احمر نے اپنے لب اس کی پسیجی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھ دیے"۔ ملیحہ ساری جان سے پسینے میں نہا گئی۔ جیسے اکتوبر کی خنک شام مئی جون کی تپتی ہوئی دوپہر میں بدل گئی ہو۔

آہٹ محسوس ہوئی تو احمر نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ مریم پانی لے کر آگئی تھی۔ احمر نے پانی کا گلاس ملیحہ کی طرف بڑھا دیا۔

"ملیحہ —— یہ پانی پی لیجیے —— دیکھیے نا —— کتنا پسینہ آرہا ہے"

ملیحہ کو محسوس ہوا وہ بہت پیاسی ہے۔ حلق سوکھ رہا تھا۔ اس نے گلاس تھام لیا۔ احمر چلے گئے۔ ہنستے گنگناتے۔ اور ملیحہ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئی۔

سچ کہنا ملیحہ!۔ احمر بھائی کی پیاس ادھر کیسے منتقل ہو گئی۔" مریم نے ہنس کر پوچھا —

ملیحہ شرمانے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

شادی کے ہنگامے میں وہ شربتی، شوخ اور ذہین آنکھیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ پہلے تو وہ ان سے چھپتی پھری۔ پھر رفتہ رفتہ وہ ان سے مانوس ہوتی گئی۔ اور پھر وہ خود ہی ان کی تلاش میں رہنے لگی۔

وہ مریم کی تلاش میں اوپر جا رہی تھی۔ احمر نیچے اتر رہے تھے۔ زینے کے موڑ پر ہی اچانک وہ سامنے آگئے۔ ملیحہ ٹھٹھک گئی۔ احمر اس کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"ملیحہ!" انھوں نے اسے مخاطب کیا۔ ملیحہ کی نظریں ایک پل کے لیے اٹھیں —— پھر جھک گئیں۔ احمر نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو ملیحہ؟ قصور میرا نہیں تمھارے ہاتھوں کا ہے ۔ کیوں لگائی تھی ان ہاتھوں میں مہندی ۔۔ ؟ کہ میرا صبر و قرار ہی لٹ گیا ۔ اب ۔۔ اب دل چاہتا ہے کہ تم ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہو ۔ ہے نا یہ پاگل پن ۔۔ ؟"۔۔

"آپ ۔۔ آپ ہر وقت، ہر جگہ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھتے ہیں ۔ کہ مجھے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے ۔" ملیحہ نے فریادی لہجہ میں کہا تو احمر ہنس پڑے ۔

" اچھا ملیحہ ۔ ایک بار اعتراف کر لو کہ تمھارے دل میں بھی وہی خود سر جذبہ سر اٹھا رہا ہے ۔ جس نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے ۔"

ملیحہ نے اپنے جھکے ہوئے سر کو اس کے ہاتھوں پر ٹیک دیا ۔ اپنائیت اور سپردگی کا یہ انداز اتنا پیارا تھا کہ احمر کو ملیحہ سے اعتراف کرانے کی ضرورت باقی نہ رہی ۔ اور وہ گنگنا اٹھے ۔

" تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں ۔"

شادی کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے ۔ مہمان جا چکے تھے ۔ بس گھر والے رہ گئے تھے ۔ ملیحہ کو ابھی چند روز اور رکنا تھا ۔ اور احمر بھی اس کی وجہ سے رکے ہوئے تھے ۔۔

ٹھنڈی چاندنی میں وہ یوکلپٹس کے نزدیک کھڑے تھے ۔ اچانک احمر نے پوچھا ۔

" ملیحہ ۔۔ اس یوکلپٹس کو دیکھ رہی ہو ۔۔ ؟"۔۔

" ہاں ۔۔ بچپن سے اب تک اسے دیکھتی آئی ہوں ۔"

" ۔۔ یہ صدیوں سے اتنا ہی بلند اور عظیم ہے ۔ اسے اپنی محبت کا شاہد کیوں نہ بنا دیں ؟ "

" اور احمر نے قلم تراش کی نوک سے سفید تنے پر دھڑکتے ہوئے دل

سے دو لفظ لکھ دیئے - اے - ایم - ملیحہ - احمر - احمر - ملیحہ -"

" دیکھو ملیحہ --- یہ بوڑھا یوکلپٹس ہماری محبت کا گواہ ہے - اس کے سینے پر ہمارے نام کندہ رہیں گے --- اور جب جب ہم یہاں آئیں گے اسے دیکھ کر اپنی محبت کی یاد تازہ کریں گے - یہ نام ہمیشہ ہمیں یہ یاد دلاتے رہیں گے کہ ہم ایک دوسرے کے ہیں -"

ملیحہ نے اپنے ہونٹ یوکلپٹس کے تنے پر کھدے ہوئے حروف پر رکھ دیئے اور پھر احمر نے اس جگہ کو چوم لیا کہ یہ ملیحہ کے لبوں کا لمس تھا - اور یہ لمس پرایا نہیں تھا - اس کا اپنا تھا -

وہ بچھڑے تو کئی سال تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے - یوکلپٹس کے تنے پر حروف اس طرح کندہ تھے - اکثر رات کی تنہائیوں میں ملیحہ اس کے قریب چلی جاتی اور اپنے لب اس حرف پر رکھ دیتی جو احمر کے نام سے وابستہ تھا - احمر - احمر - اس کا رواں رواں پکار اٹھتا - اور وہ یوکلپٹس کو بانہوں میں لے کر سسک اٹھتی --- بوڑھا یوکلپٹس افسردہ، پریشان اور دل گرفتہ سا - اسے اپنے سینے سے لگائے کھڑا رہتا - وہ ان کی محبت کا شاہد جو تھا -

جون کی گرم اور تپتی ہوئی دوپہر میں ملیحہ اپنے گھر کے اندھیرے کمرے میں بے سدھ پڑی تھی - مریم نے آہستہ سے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی -

" ملیحہ --- جلدی اٹھو --- دیکھو کون آیا ہے " --- ؟ --- وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تو مریم کو شرارت سے مسکراتے دیکھا - وہ چڑ گئی اور ناراضگی سے بولی -

"--- کیوں جگا دیا --- اچھی بھلی سو رہی تھی ؟ "

" اف پگلی --- جس کے لیے برسوں سے راتوں کی نیندیں حرام کیے ہو - وہ بے ایمان آیا ہے "

مریم نے جھنجلا کر کہا --- اور برآمدے کا پردہ ذرا سا سرکا دیا - سامنے

دالے دالان میں ایک جھلک نظر آئی سچ مچ وہی بے ایمان تھا۔ بڑے لاابالی انداز میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کی مترنم آواز آبشار کی جھنکار بن کر اس کے کانوں میں اتر گئی۔

"آہ — احمر — سچ مچ آپ آگئے؟"

ملیحہ بلک اٹھی تو مریم نے اسے گلے سے لگا لیا۔

چند دن تو وہ احمر سے کھنچی کھنچی رہی — احمر اس کے رویے سے سخت پریشان تھے۔ مجبوراً انھیں مریم کا سہارا لینا پڑا۔

"مریم پلیز — ایک بار ملیحہ سے ملاقات کرادو"

"وہ آپ سے بے حد خفا ہے احمر بھائی"

"اسی لیے تو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں"

مریم کو ترس آگیا۔ اور اس کی کوشش سے ان کی ملاقات ہوگئی وہ دونوں بغیا میں چبوترے پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ قریب ہی رات کی رانی جھک رہی تھی۔ اور خاموشی کا کرب انھیں تڑپا رہا تھا۔ اچانک احمر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور لجاجت سے بولے۔

"مجھے معاف کردو ملیحہ"

"معافی کس بات کی — آپ نے خطا ہی کون سی کی ہے"

ملیحہ کے لب کانپے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ پھر آنسو موتیوں کی لڑی بن کر ٹوٹنے لگے۔ احمر نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔

"ملیحہ — میری جان —" احمر نے اسے باہوں میں بھر لیا۔ اور سارا غبار ڈھل گیا۔ سارے گلے ختم ہوگئے۔ احمر گنگنا اٹھے۔

ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا۔
تو چراغ راہ میں جل اٹھے

اور اس رات احمر نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجے گا۔ اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا لے گا۔ سچ مچ ایک دن احمر کے والد ملیحہ کے گھر آگئے۔ فرطِ حیا سے وہ کمرہ میں جا چھپی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس لیے آئے ہیں اور تصور میں وہ شریر شوخ آنکھیں اسے محبت سے دیکھنے لگیں۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ان آنکھوں پر رکھ دیا۔

"ایسے تو نہ دیکھیے احمر۔" وہ شرما گئی۔

احمر کے والد چلے گئے۔ تو ذوقِ تجسس کشاں کشاں اسے اماں کے دروازہ پہ لے گیا۔ اس کے ابا غصے سے کہہ رہے تھے۔

"آخر انھوں نے ہماری لڑکی کو سمجھا کیا ہے ـــ جو ایسا رشتہ لے کر آئے۔ وہ مدقوق، لاوارث اور غریب لڑکا ہی بچا تھا ملیحہ کے لیے۔ انھوں نے ہمت کیسے کی اس کا رشتہ دینے کی۔

"لاحول ولا قوۃ۔"

"میں تو سمجھی تھی کہ وہ احمر کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔"

اماں بے چاری نے اپنی ناسمجھی کا گویا اعتراف کیا۔ "ہنہ بھئی ـــ اپنے بیٹے کے لیے تو وہ بڑے اونچے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انگلینڈ امریکہ کے خواب، اونچے گھرانے کی دولت مند لڑکی کے خواب! میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مفلس اور لاوارث لڑکا آپ کو اتنا ہی پسند ہے تو اپنی کسی لڑکی کی شادی اس سے کر دیجیے۔ میری بیٹی بھاری نہیں ہے میرے اوپر۔"

ـــ ملیحہ اپنا گھومتا ہوا سر تھام کر وہاں سے ہٹ آئی اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے سارے خواب کرچی کرچی ہو گئے۔ "کیا احمر کی بات کا جواب لے کر احمر کے والد آئے تھے۔؟" اس کے والدین کو ذلیل کرنے سے ان کا مقصد یہی تھا کہ میں ان کے بیٹے کے لائق نہیں ہوں۔ کیا ہوئے احمر آپ کے وہ وعدے۔ ـــ کہاں گئے وہ حسین و دلفریب عہد۔؟"

ملیحہ سسکتی رہی۔ اس کے بعد اس نے احمر کو کئی خط لکھے۔ لیکن احمر نے کسی خط کا جواب نہ دیا۔ صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کا وجود بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وہ جو اس کی رگِ جاں سے زیادہ قریب تھا ۔۔ آج اجنبی بیگانہ اور غیر ہو چکا تھا۔

ملیحہ کے لیے ایک اچھا رشتہ آیا جسے اس کے والدین نے منظور کر لیا۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی بکھرتی رہی۔ لیکن مخالفت میں ایک لفظ نہ کہہ سکی ۔ وہ احمر کی یاد کو سینے سے لگائے کسی اور کی ہو گئی۔

ایک بار پھر ملیحہ نے گڈھی کی سرزمین پر قدم رکھا تو ۔۔ دیرینہ یادیں زنجیر بن کر لپٹ گئیں ۔ وہی کھیت ۔۔ باغ ۔ گلیاں اور حویلیاں ۔۔ اور وہی کوٹھیں کا پیڑ ۔۔ جو اب کچھ اور بوڑھا ہو چکا تھا۔ جس کے شفیق سینے میں اس کی محبت کا راز دفن تھا۔ ملیحہ نے دیکھا، ناموں کے حروف دھندلے ہو گئے تھے۔ احمر کی محبت کے نقوش بھی تو دھندلا چکے تھے۔

وہ اپنی ایک سال کی بچی کو زانو پر لٹائے سُلا رہی تھی۔ مریم آکر اس کے پاس بیٹھ گئی ۔ اور بچی کے سنہری بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ مریم اس کی دوست اور غمگسار تھی ۔ وہ اس کی زندگی کے المیہ سے اچھی طرح واقف تھی۔ ان دنوں جب احمر اور ملیحہ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار رہتے تھے ۔ اس نے ان کے درمیان پیغامبری کی تھی ۔ ملیحہ کے بنائے ہوئے رومال احمر تک پہنچائے تھے ۔ ان میں اکثر صلح بھی کرائی تھی ۔ اور ملیحہ کو دلاسہ بھی دیا تھا اور احمر سے جھگڑا بھی کیا تھا۔ اسے ملیحہ بہت عزیز تھی ۔۔ بہت پیاری تھی۔

"ملیحہ"! ۔۔ مریم نے آہستہ سے پکارا تو وہ چونک پڑی۔ اس کے پریشان خیالات اور پراگندہ افکار اسے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکاتے پھر رہے تھے۔ اُف یادِ ماضی کا کرب چین نہیں لینے دیتا۔

"ملیحہ ۔۔ احمر بھائی آئے ہیں" ۔۔

"احمر — وہ — وہ — اچھا —"۔

ملیحہ اچانک پریشان ہو اٹھی۔ اور پھر جیسے اس نے خود پر قابو پالیا۔

مریم اس کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

"وہ سب سے ملنے آئے ہیں۔ — بیرونِ ملک جا رہے ہیں۔ شاید اب کبھی واپس نہ آئیں —"

"ہوں —" ملیحہ "ہوں" کہہ کر رہ گئی —

"ایک بات کہوں ملیحہ — تم بُرا تو نہ مانو گی — وہ — احمر بھائی تم سے ملنا چاہتے ہیں —"

"کیوں — ؟ — کیوں ملنا چاہتے ہیں — ؟" وہ چیخ پڑی۔

"یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کیسے تل تل کر کے مر رہی ہوں ؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کی جدائی میں میرا کیا حال ہو رہا ہے — ؟ — ان کے بغیر میں کیسی بے حال ہو رہی ہوں ؟ —" مجھے ان سے نہیں ملنا ہے مریم — ! میں کسی اور کی امانت ہوں — یہ بچی اس حقیقت کی شاہد ہے — ان کی محبّت جھوٹی تھی — ان کے دل میں کھوٹ تھا — اس لیے انھوں نے اپنی اس جھوٹی محبّت کا گواہ اس گونگے بہرے یوکلپٹس کو بنایا تھا — تاکہ وہ مجھے ٹھکرا دیں اور یہ کچھ کہہ نہ سکے۔ .... تو مریم — سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہو گیا — اب وہ کیا چاہتے ہیں — میں اپنے شوہر اور بچی سے بے وفائی نہیں کر سکتی —

ملیحہ سِسک اٹھی — اور مریم اتنی شرمندہ ہوئی کہ اسے دلاسہ بھی نہ دے سکی۔

احمر کی روانگی کا دن تھا — مریم نے کئی بار آکر احمر کا پیغام دیا کہ وہ آخری بار اس سے ملنا چاہتے ہیں — لیکن ملیحہ کی نا — ہاں میں نہ بدلی — آخر مریم اسے سنگدل کا خطاب دے کر خفا ہو کر چلی گئی — احمر کو رخصت بھی تو کرنا تھا —

سہ پہر ڈھلی، شام اتری — اور پھر شام کے ملگجے اندھیرے رات میں

بدل گئے۔ ملیحہ بستر میں پڑی رہی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ سب لوگ احمر کو رخصت کرنے گئے تھے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔

"ملیحہ!" مریم نے اسے پکارا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی رہی۔ مریم کہتی رہی۔

"ملیحہ۔ احمر بھائی چلے گئے۔ وہ آج پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اور ملیحہ! احمر بھائی نے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ تمھیں چاہتے رہیں گے۔ اگر دل چاہے تو کبھی کبھی یاد کر لینا۔" ملیحہ نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا دیے۔ اس کی سُرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ مریم اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔ تڑپ گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ ملیحہ گھنٹوں سے رو رہی ہے۔!

"مریم۔ یاد تو اس کو کیا جاتا ہے۔ جسے بھول جاتے ہیں۔ اور میں اس بے وفا کو بھولی کب تھی۔ ۔۔"

ملیحہ بے آواز رو دی تو مریم نے اسے لپٹا لیا۔

رات میں بڑے زور کا طوفان آیا۔ اور صبح سب نے دیکھا۔ بوڑھا، مہربان اور سب کا غمگسار یوکلپٹس جڑ سے اکھڑ کر گر چکا ہے۔ شاید ملیحہ کے درد کو سہارنے کی طاقت وہ کھو چکا تھا۔ اور اب سب کے قدموں میں شرمندہ اور سرنگوں پڑا تھا۔

بیچارہ۔ بوڑھا یوکلپٹس۔

سیڑھیاں

نفیسہ نے آفس کی چکنی، صاف ستھری سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کے پاؤں کانپ اٹھے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے مضبوطی سے ریلنگ تھام لی اور اپنے دائیں ہاتھ کی چھڑی کو احتیاط اور مضبوطی سے پکڑ کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

برسوں وہ ان سیڑھیوں پر چڑھتی اترتی رہی تھی۔ لیکن تین سال پہلے ایک دن اچانک اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور کئی سیڑھیوں تک لڑھکتی چلی گئی۔ اس کے بعد تو وہ نیچے ہی نیچے پھسلتی گئی۔ کوئی روک، کوئی سہارا نہ ملا۔ اس پاتال کا کوئی انت، کوئی خاتمہ نہیں تھا۔ اور اب ایک بار پھر وہ یہاں واپس آگئی تھی۔ وہی سیڑھیاں تھیں۔ سفید اور کالے موزیک کی چکنی، صاف ستھری۔ وہی آفس اور قریب قریب وہی جانے پہچانے لوگ لیکن پھر بھی سب کچھ کتنا بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

"ارے میم صاحب!"

سب سے پہلے چپراسی رام رکھا نے اس کو دیکھا اور خوشی سے چلّا پڑا۔ پھر آس پاس کے کمروں سے کئی آدمی نکل کر آ گئے اور اسے گھیر لیا۔ ان کی اس محبت اور خلوص پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ سب کے سلاموں کا مسکرا مسکرا کر جواب دیتی ہوئی اور بہنوں کو تو وہی سلام کر کے دعائیں لیتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

کمرہ اسی طرح تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ میز کرسیاں۔ سائیڈ میں پڑا ہوا صوفہ، کلاک۔ الماری۔ گل دان کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ نئے سال کے کلنڈر کے سوا سب کچھ اسی طرح تھا۔ اور پھر سپرنٹنڈنٹ ہاشمی صاحب آ گئے۔ اس نے تعظیم کے لیے اٹھنا چاہا تو انھوں نے جلدی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے کہا۔

"بیٹھو نفیسہ! تکلّف کی ضرورت نہیں ہے۔ آج تم کو دیکھ کر۔ یہاں اپنے درمیان پا کر خوشی ہوئی۔ لیکن جب تم یہاں سے گئی تھیں۔ تب کی اور آج کی خوشی میں بڑا فرق ہے۔ تین سال کے عرصہ میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ لیکن عزیزہ! مجھے مسرّت ہے کہ تم نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم سب تمھارے ہمدرد اور دوست ہیں۔ تم دل کا سارا بوجھ ہٹا کر یکسوئی سے کام کرو۔"

نفیسہ نے سر جھکا کر آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن ہاشمی صاحب جھکی جھکی پلکوں پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ چکے تھے۔ بڑی محبت سے کہنے لگے۔

"بیٹی! جو کچھ انسان کھو دیتا ہے۔ اس کا دوبارہ پانا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس کھونے اور پانے کے علاوہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اور وہ ہے زندگی۔ ابھی تمھارے سامنے ساری زندگی ہے۔ اپنی بھی اور بچوں کی بھی۔ زندگی کی حقیقت سمجھ کر قبول کر لو تو بہت سے غموں اور فکروں سے نجات مل جائے گی۔ خدا تم کو

صبر اور سکون عطا کرے۔"

" شکریہ ہاشمی صاحب! اگر آپ میرا حوصلہ نہ بڑھاتے تو شاید میں دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکتی۔"

" ایسا نہ سوچو نفیسہ ــــ یہ تو میرا فرض تھا۔"

ہاشمی صاحب اس کا شانہ تھپتھپا کر چلے گئے۔

وہ دن اتنا پرمسرت اور خوش گوار گذرا کہ نفیسہ سچ مچ سب کچھ بھول گئی رہی ــــ آفس ٹائم ختم ہوا تو وہ باہر آگئی۔ اور رام دکھا کو اپنے روم کی چابی دے کر سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی۔

اچانک کچھ بھولی بسری یادوں نے اس کا دامن تھام لیا۔ اور وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

اس وقت سلویا آگئی، ہنس مکھ سی ٹائپسٹ ــــ اس نے جھٹ نفیسہ کا ہاتھ تھام لیا۔

" میڈم آپ آرام سے اتریں۔"

" تھینک یو سلویا۔" وہ مسکرائی ایک پھیکی سی مسکراہٹ ــــ اور سلویا اس کے بچوں کی باتیں کرنے لگی۔ وہ بھی سب کچھ بھول کر گڑیا سی بیٹی شیمو اور نٹ کھٹ سے ثومان کے متعلق بتانے لگی۔ نیچے رکشہ والا اس کا منتظر تھا۔ سلویا نے اسے رکشا میں بٹھا دیا ــــ اور " بائی بائی" کہہ کر اسٹینڈ کی طرف اپنی سائیکل لینے چلی گئی ــــ

رکشا پر ہجوم سڑکوں پر راستہ بناتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔ لیکن یہ منزل مال ایونیو کا وہ خوبصورت بنگلہ نہیں تھا جو نفیسہ کے خوابوں کا حسین تاج محل تھا۔ جسے اس نے بڑے ارمانوں سے سجایا سنوارا تھا۔ جس کے درودیوار اسے محبوب تھے۔ جس کے پودوں، پھولوں اور بیلوں میں اس کی گلابی پوروں کا پیار محبت بس رچا ہوا تھا۔ آخر پیار کب تک وہ سکتی ہے؟ اس کے خلوص اور

محبت کی قدر و قیمت کم ہوتی گئی اور ایک روز بالکل ہی ختم ہو گئی ۔ یہاں تک کہ اسے سوچنا پڑا کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے ۔؟ یا اسے ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے ——— پہلی بیوی کا تو قصور یہ تھا کہ وہ جاہل اور غیر مہذب تھی اور اس کا قصور ؟ —— شاید یہ کہ وہ پڑھی لکھی اور شائستہ تھی ۔ مرد کا قصور تو کبھی نہیں ہوتا ۔ سماج اسے کسی صورت میں بھی قصوروار نہیں ٹھہراتا ۔ اور ایک بار پھر وہ داغ داغ دل اور تار تار آنچل لیے ان ہی تاریک گلیوں اور اس شکستہ گھر میں لوٹ آئی ۔

نفیسہ کے والد اوسط حیثیت کے مالک تھے ۔ لیکن انھوں نے اپنے بچوں کو اچھی طرح تعلیم دلوائی تھی ۔ ان کے انتقال کے وقت گھر میں اثاثے کے نام پر بس چند سارٹیفکٹ اور ڈگریاں تھیں ۔ چنانچہ نفیسہ نے ملازمت کر لی ۔ جلد ہی چھوٹا بھائی بھی سروس میں آگیا اور ان کا گھر صبر و شکر سے عزت کی زندگی گذارنے لگا ۔ لیکن خوابوں پر تو کسی کا بس نہیں ہوتا ۔ یہ تو شکستہ دالانوں اور ٹوٹی ہوئی چھتوں میں بھی در آتے ہیں ۔ ہر نوجوان لڑکی کی طرح وہ بھی حسین خواب دیکھنے لگی ۔

ایک اچھا سا جیون ساتھی ۔ پیارے پیارے بچے ۔
اپنا گھر ۔ چھوٹا سا ، خوبصورت سا گھر ۔

خواب اس لیے تو نہیں دیکھے جاتے کہ ان کی تعبیر مل ہی جائے ۔ خواب تو بس خواب ہی ہوتے ہیں ۔ لیکن نفیسہ کے خوابوں کی تعبیر بھی مل گئی ۔ زید کے روپ میں ۔ اس کے سارے سپنے زندہ حقیقت بن کر اس کے سامنے آگئے ۔

زید اپنے دوست علی رضا سے ملنے آفس آیا تو اس نے زید کو نفیسہ سے متعارف کروایا ۔ نفیسہ اور علی رضا ایک ہی جگہ بیٹھتے تھے ۔ زید کو یہ سادہ سی سنجیدہ لیکن پرکشش لڑکی بہت پسند آئی ۔ وہ اکثر رضا سے ملنے کے لیے آنے لگا ۔

فرید ایک فرم میں پرچیز آفیسر تھا۔ اس کی پرسنالٹی بھی اچھی تھی۔ بے حد مہذّب اور خوش مزاج تھا۔ نفیسہ بھی اس کو پسند کرتی تھی۔

ایک دن علی رضا نے اسے بتایا کہ فرید اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کی نظروں سے اس کی پسندیدگی کا اندازہ کر چکی تھی۔ اب اس کا پیغام سن کر بے حد شرمائی۔ آہستہ سے بولی۔

"امّی سے بات کرو۔"

تاہم نفیسہ کو اس کی یہ بات اچھی لگی کہ کسی قسم کا چھچھورپن کیے۔ بغیر اس نے براہ راست شادی کی بات کی۔

"پہلے تم بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے فرید کے بارے میں۔"

علی رضا نے پوچھا۔

"امّی سے بات کرنے کے لیے کہہ جو رہی ہوں۔" وہ شرمائی۔

"ایک بات تم کو بتانا ضروری ہے نفیسہ! ۔ فرید شادی شدہ ہے۔ اس کی ایک بچی بھی ہے۔"

رضا نے کہا۔ نفیسہ کو اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ خاموش رہ گئی۔

"دراصل یہ شادی والدین کی پسند سے ہوئی تھی۔"

رضا نے اس کی خاموشی محسوس کر کے کہا۔

"زیادہ تر شادیاں والدین کی پسند سے ہوتی ہیں۔"

"لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ فرید کی بیوی دیہات کی جاہل اور گنوار لڑکی ہے۔ اس لیے ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ نتیجے میں طلاق ہو گئی۔"

رضا نے بتایا۔

"اور بچی ۔۔۔؟"

"بچی اپنی ماں کے پاس ہے۔ فرید اس کے اخراجات کے لیے ہر ماہ

پیسے بھجواتا رہتا ہے۔ بس اس کے سوا فرید میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ اب بتاؤ کیا میں امی سے بات کروں ؟"

"مجھے سوچنے کا موقع دو رضا !"

"تم پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو ــ فرید کو خوش رکھ سکتی ہو۔ اس کو ایسی شریکِ حیات چاہیے۔ جو سوسائٹی کے آداب سے واقف ہو۔ شوہر کی ضرورت اور خوشی کا خیال رکھ سکے۔ اس کا خیال ہے کہ تم بہت موزوں شریکِ زندگی ثابت ہوگی۔"

"یہ ابھی کیسے کہا جا سکتا ہے رضا ؟ ــ جب تک ایک دوسرے کو قریب سے نہ دیکھیں ــ طبیعت، عادت اور خصلت سے نہ واقف ہوں کسی قسم کا اندازہ لگانا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اور اگر کسی رشتے سے منسلک ہونے کے بعد پتہ چلے کہ کئی باتیں متنازعہ ہیں تو اختلافات ہونا ضروری ہیں ــ انھیں پہلی بیوی سے نباہ کرنا چاہیے تھا۔ پھر ایک بچی تھی ــ اس کا خیال کرکے درگذر سے کام لیتے۔ اس طرح تو صریحاً دونوں کی زندگی برباد ہوئی۔"

"دیکھو نفیسہ ! ــ فرید ایک بھرپور اور خوش گوار زندگی گزارنا چاہتا ہے۔"

"اگر میں ان کے معیار پر پوری نہ اتری اور انھیں ایسی زندگی دینے میں ناکام رہی تو پھر میرا بھی وہی حشر ہوگا۔ کیوں کہ اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا کہ ان میں درگذر کرنے کا مادّہ نہیں ہے ــ قوتِ برداشت کی کمی ہے۔ اور نباہ کے لیے تو قدم قدم پر درگذر سے کام لینا پڑتا ہے۔"

"اب تم خواہ مخواہ اتنا آگے کا سوچ کر ہلکان ہو رہی ہو ــ" رضا نے اس کی دلیلوں سے الجھ کر کہا۔

"مجھے سوچنے کا موقع دو رضا پلیز۔"

نفیسہ نے جلدی سے کہا تو رضا ہنسنے لگا اور اس کی بات مان گیا۔

پھر ایک دن آفس سے واپسی میں فرید نے نفیسہ کو گیٹ کے پاس روک لیا۔ وہ اس وقت بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"مس نفیسہ! میں آپ کے چند منٹ لینا چاہتا ہوں"۔

"فرمائیے"۔

نفیسہ اچانک اسے سامنے دیکھ کر شرما گئی۔

"ایسے نہیں — آپ ادھر تشریف لائیں"۔

فرید نے کار کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ متذبذب سی کھڑی رہی تو وہ لجاجت سے بولا۔

"بس چند منٹ کے لیے ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں گے پھر میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ پلیز آئیے نا؟

مجبوراً نفیسہ بیٹھ گئی۔ فرید نے اسٹیرنگ سنبھالا اور پھر وہ "بلیو ہیون" کے ایک پرسکون گوشے میں جا بیٹھے۔ فرید نے کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیا۔ نفیسہ نظریں نیچی کیے اپنے پرس کے اسٹریپ سے کھیلتی رہی۔

"مس نفیسہ، علی رضا نے مجھے اس دن کی ساری گفتگو بتا دی ہے"۔

نفیسہ کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

"نفیسہ، یقین کیجئے وہ شادی میری مرضی کے خلاف بچپن کی منگنی، واسطہ دے کر کر دی گئی تھی۔ وہ لڑکی میرے معیار سے بالکل الگ، ان پڑھ اور گنوار تھی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں، نفیسہ میں اس سے الگ ہونے کے لیے مجبور تھا۔ زندگی بس اسی کا نام تو نہیں ہے کہ مرد صبح، شام روٹی کھا لے۔ زندگی کے تقاضے تو بہت حسین ہوتے ہیں۔ اور میں زندگی کے ہر حسن سے محروم تھا۔ دوست احباب ملنے آتے تو جو شخص بھی جاتے کی کشتی باہر آجاتی۔ سب لوگ میرا مذاق اڑاتے تھا۔ ہار کر گھر آتا تو وہ دکھ سکھ کا لحاظ کیے بغیر کھانے کی سینی میرے سامنے رکھ دیتی۔ میں جانور تو نہیں ہوں کہ بس راتب سے مطمئن ہو جاؤں۔ گھر کا وہ حلیہ رہتا کہ بھاگ

جانے کو جی چاہتا ہے۔ کوئی چیز ڈھنگ سے نہ رہتی۔ کوئی بات قاعدے کی نہ ہوتی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ پڑھی لکھی بیوی ہو۔ چار لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب جانتی ہو۔ بات کرنے کا سلیقہ ہو۔ گھر صاف ستھرا رہے اور بیوی میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ لیکن میں کسی بات سے مطمئن نہ تھا۔ مجبوراً مجھے اس سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اور اب مجھے اپنی مطلوبہ ساری صفات آپ کے اندر نظر آئیں۔ اس لیے میں نے اپنے دل کی بات آپ تک پہنچادی "

فریدہ نے بات ختم کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ نفیسہ خاموش رہی۔ فریدہ نے پھر کہا۔

" رضا کہتا تھا کہ تم اس بات سے بددل ہو کہ میں ایک بیوی کو طلاق دے چکا ہوں۔ تمھاری بددلی اپنی جگہ درست ہے۔ نفیسہ۔ میں نے ساری باتیں تم کو بتا دی ہیں۔ اب بھی کوئی اندیشہ باقی ہو تو میں وہ بھی دور کر دوں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تم کو کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ تم جو کہو گی وہی کروں گا۔ اتنے دن سے تم کو دیکھ رہا ہوں۔ تمھارے مزاج سے کسی حد تک واقف ہو چکا ہوں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ تم۔ میرا مطلب ہے کہ ۔۔۔ وہ چپ ہو گیا۔ نفیسہ نے سر جھکا لیا۔

" کیا میں امی سے بات کرنے کے لئے رضا کو بھیجوں ؟"

" رضا کو کیوں ۔۔ ؟" ۔۔ نفیسہ نے جلدی سے پوچھ لیا۔

" تم جانتی ہو کہ گھر والے مجھ سے ناراض ہیں۔ اس لیے اور کسی کے شریک ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا "

اس کا مطلب ہے کہ آپ خود ہی اپنی ذمہ داری پہ قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔

" ہاں نفیسہ ۔۔ اور اب تم انکار نہ کرنا۔ مجھے تمھاری ہر شرط منظور ہے۔ ہر خوشی منظور ہے۔ بس تم ہاں کہہ دو "

" اس وقت ریسٹورنٹ میں ریکارڈ پلیئر پر کسی نے اپنا پسندیدہ ریکارڈ

لگا دیا۔ اور فضا میں ایک دلکش نغمہ گونجنے لگا۔

"جو تم کو ہو پسند وہی بات کریں گے۔"

فرید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور بڑے اعتماد سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ خاموش سا وعدہ، یہ جانفزا سا عہد نفیسہ کی روح کو متاثر کر گیا۔ اور ایک مرد کے بھاری پر اعتماد ہاتھ کے دباؤ نے اس کی گداز نرم ہتھیلی کو پسینے سے تر کر دیا۔ وہ کئی منٹ تک اپنا ہاتھ نہ ہٹا سکی۔ اور نہ نظریں اٹھا کر دوبارہ فرید کی طرف دیکھنے کی ہمت کر سکی۔

رضا نے نفیسہ کی امی سے مل کر بات پکی کر لی۔ چند دوستوں کی موجودگی میں بڑی سادگی سے فرید کا عقد نفیسہ سے ہو گیا۔ اور وہ تنگ تاریک گلیوں سے نکل کر مال ایونیو کے خوبصورت اور کشادہ بنگلے میں آ گئی۔ فرید نے اس کے دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دیں۔ ایک مہینہ تو پر لگا کر اڑ گیا۔ وہ خوبصورت مقامات کی سیر کرتے رہے۔

اتنے دنوں میں نفیسہ نے فرید کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی بھرپور اندازہ لگا لیا اور کافی محتاط ہو گئی۔ فرید بے حد شکی مزاج اور حاسد تھا۔ یہ اس کے کردار کی سب سے بڑی خامی تھی۔ اگر وہ کسی کو غور سے نفیسہ کی طرف دیکھتے پاتا تو وہ فوراً اس جگہ سے چل دیتا۔ اگر کوئی اپنی رو میں نادانستہ بھی دو چار دفعہ ان کے پاس سے نکل جاتا تو اسے شک ہوتا کہ ضرور وہ آدمی نفیسہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ نفیسہ کو اس کی اس بات پر ہنسی آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ چڑ بھی جاتی تھی لیکن پھر بھی وہ خوش تھی۔ محبت کا یہ بھی تو ایک انداز ہے۔"

نفیسہ نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی۔ وہ لوگ گھوم پھر کر واپس آئے تو نفیسہ نے بتایا کہ اس کی رخصت ختم ہو چکی ہے۔ اور اسے آفس جانا ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ وہ بدستور آفس جاتی رہے گی۔ فرید کے آفس چلے جانے کے بعد تنہا ہونے سے تو اچھا ہے کہ وہ کام کرتی رہے۔

مگر اب جو آفس جانے کا وقت آیا تو فرید نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگرچہ صاف منع بھی نہیں کیا۔ اور یوں نفیسہ آفس جانے لگی۔

ایک دن اچانک فرید نے اس سے پوچھا۔

"رضا سے تمہارے کیسے تعلقات ہیں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ — ہم ایک آفس میں کام کرتے ہیں۔ اس لیے اچھے ہی تعلقات ہیں"

"کوئی کہہ رہا تھا کہ شادی سے قبل رضا سے تمہاری خاصی دوستی تھی"

فرید نے پھر تیکھے لہجہ میں کہا۔

"دشمنی تو اب بھی نہیں ہے"

"لیکن جو بات میں جاننا چاہتا ہوں۔ تم جان بوجھ کر اس کا گول مول جواب دے رہی ہو"

"وہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"رضا سے تمہارا افیئر رہا تھا —؟"

"افیئر — رضا سے؟ —"

نفیسہ ہکا بکا رہ گئی۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ سنبھل نہ سکی۔

"وہ آپ کا دوست ہے۔ اس کی مدد سے یہ شادی ہوئی ہے۔ آپ کو ایسا نہ کہنا چاہیے"

نفیسہ نے گہرے دکھ سے کہا۔ اسے سچ مچ شوہر کے منہ سے اتنی خراب بات سن کر صدمہ ہوا تھا۔ اور اس کے وعدوں اور قسموں کی دیوار گرتی نظر آرہی تھی — جہاں اعتماد نہ ہو — اپنائیت نہ ہو — وہاں محبت کا کیا کام؟

"بہرحال تم سروس چھوڑ دو"

"اس لیے کہ آپ کو میرے کردار پر شک ہے"

"میں اپنے گھر کا سکون برباد کرنا نہیں چاہتا"

"اگر آپ کو میرے کردار پر کسی قسم کا شک و شبہ تھا تو شادی سے پہلے ہی خوب اچھی طرح دریافت کر لیتے۔ آفس میں سب ہی لوگوں سے بات کرنا پڑتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ کسی نہ کسی سے افیئر بھی ضروری ہو۔ پھر رضا سے تو ہمارے گھریلو تعلقات ہیں۔ ابّو کی زندگی سے اس کا آنا جانا ہے۔"

"مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرا حکم ہے کہ تم استعفیٰ دے دو۔"

"آپ کا شک بے بنیاد ہے فرید ـــ آپ خواہ مخواہ کی باتوں سے اپنی اور میری زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں، بہرحال میں آج ہی استعفیٰ دے دوں گی۔"

فرید چلا گیا۔ نفیسہ نے آفس جا کر سب سے پہلا یہ کام کیا کہ استعفیٰ ٹائپ کیا اور ہاشمی صاحب کی میز پر رکھ دیا۔ سارے دن وہ الجھی الجھی رہی۔ رضا نے کئی بار اس کی پریشانی کی وجہ جاننا چاہی۔ لیکن وہ ٹال گئی۔ اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا ـــ پھر ہاشمی صاحب نے اسے بلایا۔ اور استعفیٰ کا سبب معلوم کیا تو اس نے گھریلو ذمے داریوں کا عذر پیش کر دیا۔ اور کانپتے قدموں سے باہر نکل آئی۔

اس روز سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ دل بھاری اور طبیعت بے حد اداس تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس نے یہ استعفیٰ اپنی گھریلو خوشیوں کے دوام کے لیے دیا ہوتا۔ یہ شک کی دیوار ان کے درمیان کیسے کھڑی ہو گئی؟ اور کیا اس کے ملازمت چھوڑ دینے سے شک و شبہ اور بے اعتمادی کی دیوار ڈھے جائے گی ـ ؟ ـ کیا الجھنوں کا خاتمہ یہیں ہو جائے گا؟ یا یہ محض ابتدا ہے؟ اچانک نفیسہ کا پیر پھسل گیا اور وہ نیچے لڑھکتی چلی گئی۔ کتنے ہی لوگ دوڑ پڑے ـ رضا نے فرید کو فون کر کے اس کی حالت بتائی اور فوراً آنے کی تاکید کی۔ فرید آ گیا۔ ہاشمی صاحب، رضا اور مسٹر بترا، فرید کے ساتھ ہی نفیسہ کو لے کر اسپتال گئے۔ اسی وقت اسے زچہ لیڈی ڈاکٹر کے ہاں ایڈمٹ کر لیا گیا۔

دوسرے دن ایکس ریے ہوا تو پتہ چلا کہ پاؤں کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ چند دن کے بعد پاؤں کا آپریشن کیا گیا۔ اور دو ماہ اسپتال میں رہ کر وہ گھر آ گئی۔ اب اسے چھڑی کے سہارے چلنا پڑتا تھا۔ پاؤں میں نقص باقی رہ گیا تھا۔ تاہم نفیسہ مطمئن تھی کہ فرید نے اس کی کافی دیکھ بھال کی تھی۔ اتنے دن ہمدردی اور محبت سے پیش آیا تھا۔ اب شاید اس کے دل سے شک و شبہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کی بے رخی اس کے حساس دل پر قیامت ڈھا دیتی تھی۔ لیکن اب تو فرید اس کی کافی دلجوئی کرنے لگا تھا۔ وہ تناؤ اور کھنچاؤ ختم ہو گیا تھا جس نے چند روز پہلے ان کے دلوں کے درمیان فاصلے بڑھا دیئے تھے۔

.... پھر تو مان آ گیا۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ فرید کے ساتھ باہر بھی جانے لگی۔ حالانکہ ہر بار اسے ایک نئی اذیت اور کوفت سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اسے فرید کے ساتھ دیکھ کر لوگوں کو فرید سے ہمدردی پیدا ہو جاتی۔ جس کا دبے دبے الفاظ میں وہ اظہار بھی کر دیتے۔ حالانکہ ہمدردی کی مستحق تو وہ خود تھی لیکن دنیا والوں کی ساری ہمدردیاں فرید کے ساتھ تھیں۔ گویا اس کے لنگڑے پن نے فرید کو مظلوم بنا دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی نہیں سوچتا تھا کہ اس چھڑی کا بوجھ اٹھائے وہ کس طرح جی رہی ہے۔ ایک دن فرید نے اسے یہ بھی طعنہ دیا کہ محض اس کے سر دس کرنے کی وجہ سے اسے یہ روز بد دیکھنا پڑا۔

دن گزرتے گئے۔ اس کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ وہ کہیں آنے جانے کے قابل نہ رہی۔ ساتھ جاتی تو اسے ندامت اٹھانا پڑتی۔ فرید روز بروز چڑچڑا ہوتا گیا۔ اور بات بے بات اس سے الجھنے لگا۔ وہ اس کے ہر کام میں نقص نکالتا۔ اور جان بوجھ کر اس سے ہر کام جلد کرنے کو کہتا۔ .... وہ چھڑی کے سہارے دوڑ دوڑ کر سارے کام کرتی لیکن اکثر فرید دیر ہونے کا عذر داغ کر منہ پھلائے بغیر کھائے پیئے باہر چلا جاتا۔ اور نفیسہ سارے دن اداس، شرمندہ اور نادم سی گھر کا کام کرتی رہتی۔ تاکہ دوسرے وقت اسے کسی قسم کی شکایت نہ ہو اور وہ خوش رہے۔

فرید کا مزاج بگڑا دیکھ کر اس نے باہر جانا چھوڑ دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس کی دلجوئی اور خدمت کرتی۔ شاید اسی دلجوئی کے نتیجے میں گڑیا آگئی۔ فرید بھی وقتی طور سے ہی خوش ہو گیا۔ لیکن خوشیاں کب دیرپا ثابت ہوتی ہیں۔۔۔ ہاں غموں کا عرصہ صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔

ایک شام فرید آیا تو چپ چاپ اور ناراض تھا۔ نفیسہ نے چائے لگائی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی پی کر آ رہا ہوں۔ رات کے کھانے پر بھی وہ منھ پھلائے بیٹھا رہا۔ اور دو نوالے سے زیادہ نہ کھایا۔ نفیسہ نے محبت سے اصرار کیا تو اس نے سرد لہجہ میں کہا!

"میری بھوک پیاس، سکھ چین سب کچھ ختم ہو گیا ہے میں یہ سوچ سوچ کر پریشان اور شرمندہ رہتا ہوں کہ میں نے بغیر دیکھے بھالے کیوں یہ شادی کر لی۔"

"فرید' آپ ایک ایسی بات کے لیے خود کو پریشان کرتے رہتے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ـــ میں آپ کو یقین دلا کر تھک چکی ہوں کہ میں' میں صرف آپ کی ہوں فرید۔"

"میں تمھارے ماضی سے مطمئن نہیں ہوں نفیسہ"ـــ

"میرا ماضی ایک کھلی کتاب ہے فرید۔" اور پھر ماں بن کر کسی عورت کا کوئی ماضی نہیں رہ جاتا۔ وہ بس اپنے حال میں جیتی ہے اور میں بھی اپنے بچوں کی ماں ہوں۔"

"تم نے میل جول کے باوجود رضا سے شادی کیوں نہیں کی تھی۔"

"اس لیے کہ ہمارے دلوں میں ایسا کوئی جذبہ یا خواہش نہیں تھی۔"

"یا اس لیے کہ میں اس سے ہر بات میں بہتر تھا؟"ـــ

"آپ بہت بعد میں متعارف ہوئے تھے فرید ـــ اور رضا میرے ساتھ کئی سال سے کام کر رہا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں آپ کے لیے بیٹھی نہ رہتی۔ کبھی کی رضا سے شادی کر چکی ہوتی ـــ اور نہ رضا دوستی کی خاطر آپ کا رشتہ بھیجنے کرانے

کی کوشش کرتا، افسوس آپ ایک دوست کے خلوص اور نیت پر شک کرکے دوستی کے پاک رشتے کی توہین کر رہے ہیں۔"

اگر میں کہوں کہ تم دونوں نے مجھے بے وقوف بنایا تو یہ درست ہوگا۔ اس نے اپنی بلا میرے سر تھوپ دی۔ تمھارے ساتھ تفریح کی گھوما پھرا۔ اور پھر دامن بچا کر الگ ہو گیا۔ یہی نہیں، مجھے پھانس کر قربانی کا بکرا بھی بنایا اور میں کچھ نہ سمجھا۔"

"کاش رضا نے آپ کے کردار کے اس پہلو کو بھی دیکھ لیا ہوتا تو شاید آج یہ نوبت نہ آتی۔ اور میں اس جہنم سے بچ جاتی جس میں دن رات جلا کرتی ہوں۔ شک — شک — یہ شک اس گھر کو تباہ کردے گا فرید — میرا نہیں تو ان بچوں کا ہی خیال کیجئے — یہ آپ کا خون ہیں۔"

"میرا خون — ؟ کون جانے — کہ — کہ — "

"بس فرید آگے ایک لفظ نہ کہیے گا۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب مجھ میں نہیں ہے۔"

نفیسہ سسک اٹھی اور فرید تنتناتا ہوا چلا گیا —

اس رات فرید ڈرائینگ روم میں سویا — اور دوسری صبح جلد ہی گھر سے چلا گیا اور پھر رسہ کشی اتنی بڑھی کہ اس ماحول میں نفیسہ کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ بچوں کو لے کر گھر چلی آئی۔ خود سے نہیں — فرید کے حکم پر۔ جلد ہی طلاق نامہ اسے مل گیا۔ اور ایک بار پھر وہ بے سہارا ہو گئی۔

"مرد کیا چاہتا ہے آخر ؟" —

عورت کنوارا دران پڑھ ہو تو معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اور اگر تعلیم یافتہ ہو تو اس کا کردار مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ دونوں صورتیں عورت کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہیں۔ پھر جینے کے لیے عورت کون سی راہ اختیار کرے ؟

"ممی — ممی" — پیاری پیاری آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں

اور نومان اور شیمو آ کر اس سے لپٹ گئے۔ وہ ہوش میں آ گئی۔ اس نے دونوں کو لپٹا لیا۔ اور انھیں پیار کرنے لگی اور سوچنے لگی۔

اسے ان بچّوں کے لیے جینا ہوگا۔ وہ ماں ہے۔ ان کی ذمّے داری سے نظریں نہیں چرا سکتی۔ اسے اپنی چھڑی کے سہارے ہی زندگی کی طویل اور کٹھن راہ طے کرنا ہوگی۔ فرید کے بغیر زندہ رہنے کی عادت ڈالنا ہوگی۔ اس لیے کہ ان بچّوں کو ابھی ترقی کی بہت سی منازل طے کرنا ہیں۔ کامیابی کی ان گنت سیڑھیاں چڑھنا ہیں —— ان بچّوں کو اس کی ضرورت ہے۔ فرید کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تو نہ سہی۔

—— اور نفیسہ نے نومان اور شیمو کو باہوں میں لے کر بھینچ لیا۔

درِ توبہ

'جلترنگ' کے خوبصورت پورٹیکو میں چمچماتی ہوئی کار میں آکر رکیں تو ہوٹل کے منیجر مسٹر کلیفرڈ نے اپنے معزز مہمانوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ان کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھلا جا رہا تھا۔ اور اندرونی جوش و اضطراب نے ان میں ایک سیمابی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

یسما نے بصد ناز گاڑی سے نیچے قدم رکھا اور آہستہ خرامی سے سیڑھیاں چڑھ کر داخلی پھاٹک میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ شاید پرانی وضع کے محراب دار پھاٹک نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ جو امریکی طرز کے پورٹیکو سے ذرا بھی میل نہیں کھا رہا تھا۔ قدیم اور جدید کے امتزاج سے جس حسن نے جنم لیا تھا وہ اپنی آپ مثال تھا۔

قیمتی لکڑی کے بنے ہوئے پھاٹک کے کواڑوں میں کٹ ورک کی خوبصورت پھولدار بیلیں بنی ہوئی تھیں اور ہر پھول کے قلب میں سنہری منقش کیلیں اس

خوبصورتی سے پیوست تھیں کہ ان پر جگ مگ کرتے ستاروں کا گمان ہوتا تھا
پھاٹک کی محرابوں کے آخری سرے پر کنول کے سنہری پھول بنے تھے ۔

سیما آگے بڑھی ' راہداری میں ، دونوں طرف دیواروں میں بیچ شاخ اور سہ شاخے
مناسب فاصلوں پر آویزاں تھے ۔ جن میں شمعوں کی جگہ بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے ۔

راہداری کے اختتام پر بڑا ہال تھا جس کی سجاوٹ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی
دور کے آراستہ دربار ہال میں آ گئے ہوں ۔ ڈاٹ کی بنی ہوئی بلند چھت میں لمبی لمبی
سنہری زنجیروں کے سہارے قیمتی جھاڑ اور کنول لٹک رہے تھے ۔ دیواروں میں جگہ جگہ
منقش فریموں میں جھل جھل کرتے آئینے آویزاں تھے ۔ ایرانی قالین ، خوبصورت صوفہ سیٹ
اور اسٹینڈ پر رکھے ہوئے گلدانوں میں تازہ پھول اور اگردانوں میں سلگتا ہوا خوشبودار
عود و عنبر ـــ ماحول ایسا خواب آگیں ـــ کہ حقیقت کے بجائے خواب ' کا گمان ہو
ـــ اور پھر ہال کے مشرقی گوشہ سے ایک خوبصورت چوبی زینہ چکر لگاتا ہوا اوپر کی منزل
کی طرف بڑھتا نظر آتا تھا ۔

سیما دھیرے دھیرے بہت سنبھل سنبھل کر زینہ چڑھنے لگی ۔ جیسے وہ پہلی بار ایسے
زینہ پر چڑھ رہی ہو ۔ جب ہی ایک پھول کے گملے میں اس کی ساڑی کا آنچل اٹک گیا ۔
جیسے اچانک ہی کسی نے اس کا آنچل تھام لیا ہو اور ایک مدھر آواز اس کے کانوں میں
سرگوشی بن کر ابھری ۔

" سیم تن ـــ تم میرے پیار کی انتہا بن کر یہاں آئی ہو ! ـــ وعدہ کرو کہ میرے
دل سے ـــ اور اس گھر سے تم کبھی دور نہیں جاؤ گی " ؟ ـــ

' امروز ـــ امروز ـــ ' وہ زیر لب بڑبڑائی ـــ اور دل میں ایک ننھی سی کرچ
چبھ گئی ـــ یادوں کی کرچ ـــ

" میڈم ! ـــ "

دیپک نے اسے گم صم دیکھ کر دھیرے سے پکارا تو وہ چونک پڑی ـــ اور
وحشت میں اٹھی ۔ پھر آگے بڑھ گئی ۔ راہداری میں بچھے ہوئے کارپٹ پر چلتے ہوئے

اس کو تلوؤں میں چبھن کا احساس ہونے لگا۔ یہ کیسی چبھن تھی جو دل سے نکل کر رفتہ رفتہ سارے جسم میں پھیلتی جارہی تھی۔

دیپک نے آگے بڑھ کر کمرہ کا آسمانی پردہ اٹھایا۔ وہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ کمرہ کی دیواروں پر آسمانی رنگ کا پینٹ تھا۔ پردے۔ بیڈ کور۔ لیمپ کا شیڈ۔ فلاور پاٹ، صوفہ سیٹ کے مخملیں کشن، سب آسمانی رنگ کے تھے۔ یہ اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔ ٹھنڈا۔ پرسکون اور فرحت بخش۔

وہ خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ مسہری پر لیٹ کر اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کا سکریٹری دیپک اسے کمرہ تک پہنچا کر واپس جاچکا تھا۔ اسے ابھی سامان بھی اپنی نگرانی میں یہاں تک پہنچانا تھا۔ اور اس کی ذاتی ملازمہ سلویا کو بھی ہدایات دینا تھیں۔ اور کل کے پروگرام کے متعلق بھی اسے ضروری امور انجام دینا تھے۔

سیما اس شہر میں آئی تو بالکل نارمل تھی۔ اسے کسی قسم کی الجھن یا پریشانی نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس شہر سے اس کا ہر رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن "جلترنگ" کے پھاٹک میں قدم رکھتے ہی اس کا پورا وجود اندر سے باہر تک کسی ان دیکھی طاقت نے ہلا کر رکھ دیا۔ اور پھر یہ کمرہ۔ یہ ماضی کی خوبصورت یادوں کا مدفن۔ جہاں وہ امروز کا ہاتھ تھام کر داخل ہوئی تھی اور اس کا زرتار گھونگھٹ اٹھا کر اس نے اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشی کی تھی۔

"سیم تن! تم میرے پیار کی انتہا بن کر یہاں آئی ہو۔ وعدہ کرو کہ اس دل سے۔ اور اس گھر سے تم کبھی دور نہیں جاؤ گی؟"

اس نے امروز کے چوڑے سینے میں منھ چھپا کر بڑے اعتماد سے کہا تھا "میں آپ کے دل سے دور گئی امروز۔ تو دنیا ہی سے چلی جاؤں گی۔"

لیکن وہ اپنے عہد سے ہٹ گئی اور زندہ رہ کر اس کی زندگی سے۔ اس کے دل سے۔ اور اس کے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ البتہ وہ اس دنیا سے نہ

جا سکی۔ کیونکہ اس نے یہ زندگی اپنے لیے خود پسند کی تھی۔ جہاں چاروں طرف خوشامدیوں کا مجمع تھا، تعریف تھی۔ شہرت تھی۔ بیرونِ ممالک کے سفر تھے، نئے نئے تجربے تھے۔ نئی نئی مسرتیں تھیں۔ دنیا کی ہر خوشی اسے حاصل تھی لیکن بس ایک چیز نہیں تھی۔ پرخلوص محبت اور بے غرض چاہت ۔۔ ہاں۔ امروز کو چھوڑ کر پھر اسے ایسا ٹوٹ کر چاہنے والا نہ ملا۔ اور وہ محبت کے لیے ترستی رہی۔ جیسے بے کنار سمندر میں پیاسی سیپ ۔۔

"میڈم!" سلویا نے ڈرتے ڈرتے مخاطب کیا۔۔ وہ نہ جانے کب سے کھڑی تھی۔

"آپ لباس تبدیل کر لیں میڈم"۔

"اوہ"۔۔ وہ چونک پڑی۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ لباس بدلا، بالوں پر برش کر کے وہ سنہری پرتکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گئی اور سلویا سے کافی منگوانے کے لیے کہا اور پھر جب کافی آ گئی۔ تو اس نے اپنے ہاتھ سے کافی تیار کی اور سلویا سے کہا۔

"سلویا۔ تم جاؤ آرام کرو"۔

سلویا گڈ نائٹ کہہ کر چلی گئی۔ وہ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی رہی۔ اور سوچتی رہی۔

لائٹ آف کر کے اس نے نیلگوں بلب روشن کر دیا۔ خوبصورت شیڈ کے پیچھے بلب کی دھیمی پرسکون روشنی ایک دائرے میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور یادیں اسے ماضی کے صحرا میں بھٹکانے لگیں ۔۔ جہاں قدم قدم پر یادوں کے سنگریزے بکھرے پڑے تھے۔ رنگ برنگی۔ چمکیلے اور خوبصورت سنگریزے ۔۔ وہ ایک ایک سنگریزہ چنتی رہی۔

"مس سیم تو آپ کا ڈانس پروگرام بڑا شاندار رہا۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔

اس کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔

" سیم تن ۔۔۔ یہ ہمارے چیف گیسٹ مسٹر امروز ہیں ۔۔۔ شہر کے رئیس اور یہاں کے کلچرل سوسائٹی کے روحِ رواں ۔ آج سیلاب زدوں کی امداد کے لیے آپ نے دس ہزار کی گراں قدر رقم دی ہے "۔

اس کی پرنسپل نے امروز سے اس کا تعارف کرایا۔ اس نے جھک کر انھیں آداب کیا۔ امروز نے پھولوں کا حسین گلدستہ اسے پیش کیا جسے قبول کر کے اس نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

'کتھک کیندر' نے سیلاب زدوں کی امداد کے لیے ایک پروگرام کا انتظام کیا تھا۔ سیم تن 'کتھک کیندر' کی ہونہار طالبہ اور کتھک رقص کی ماہر تھی۔ اسے بچپن ہی سے رقص کا شوق تھا۔ خصوصاً ہندوستان کا کتھک اسے بہت پسند تھا۔ اس کی ماں جرمن تھی۔ باپ ہندوستانی۔ وہ لوگ کلکتہ میں رہتے تھے۔ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ رقص سیکھتی رہی۔ پھر کتھک سیکھنے کے لیے اس نے کتھک کیندر میں داخلہ لے لیا۔ اب وہ کتھک کی اچھی رقاصہ تھی۔ اب تک وہ پبلک میں کئی بار اپنا ڈانس پیش کر چکی تھی۔ اور ہمیشہ اس کے رقص کی تعریف ہوئی۔ اخباروں نے، رسائل نے اور عوام نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔۔۔ وہ اپنے اس فن کو بامِ عروج پر پہنچانے کی متمنی تھی۔ اس لیے جب امروز نے اس کی تعریف کی تو اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ پھر امروز نے دوسری بار خود اس سے ملنے آ گئے۔ 'لائینز کلب' کی طرف سے دعوت نامہ لے کر۔ کلب نے یومِ آزادی کے موقع پر ایک پروگرام ترتیب دیا تھا اور کلب کے کلچرل سکریٹری ہونے کی حیثیت سے وہ اس کے پاس رقص پیش کرنے کی درخواست لے کر آئے تھے۔ امروز کی بات وہ ٹال نہ سکی اور ان سے پروگرام میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔

پروگرام بہت شاندار ہوا۔ پریس نے خصوصیت سے سیم تن کے رقص کی تعریف کی۔ اس کا انٹرویو شایع ہوا اور تصویریں چھپیں۔

امروز۔ سیم تن کے رقص کے شیدائی تھے۔ دو چار بار کی ملاقاتوں نے انھیں اس کے حسنِ اخلاق اور حسنِ صورت کا گرویدہ بھی کر دیا۔ اور انھوں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے سیم تن کو 'غزل' میں مدعو کیا۔ شہر کے شور و شغب سے دور یہ ریسٹورنٹ آرٹ اور ادب کے شیدائیوں کے لیے ایک خوبصورت اور پرسکون جگہ تھی۔ اور اس حسین و خوابناک فضا میں امروز نے سیم تن سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔۔۔ سیم تن کا چہرہ گلابی ہو گیا اور کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ جسم کا سارا خون اس کے صبیح چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ امروز اس کا یہ روپ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

"سیم تن!" امروز نے اس کے ہاتھ کو اپنے گرم جوش ہاتھ میں لے کر پیار سے دباتے ہوئے سرگوشی کی۔

"جی۔" اس کی آواز کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت بہت جذباتی ہو رہی ہے۔ اور لفظ جی اس کے لبوں سے اس طرح پھسل کر گرا تھا۔ جیسے شبنم کا قطرہ کول پتے سے پھسل گیا ہو۔۔۔ امروز مسکرا دیے۔

"کیا تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو سیم تن کہ۔۔۔۔ زندگی کے سفر میں۔ میں تمھارا ہاتھ تھام کر چلوں؟"۔

"مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہو گا امروز؟"۔

"سچ؟۔۔ سچ کہہ رہی ہوں سیمیں؟"۔

"اگر اس سے پیارا سچ کوئی اور ہو سکتا ہے تو بھی میں یہی کہوں گی کہ یہ سچ ہے امروز"۔

"مائی لَو۔۔۔ مائی سویٹ لَو"۔

امروز نے اس کا مرمریں ہاتھ چوم لیا۔۔۔ اور پھر اس خوبصورت فضا میں ایک حسین اور مرصع غزل مکمل ہو گئی۔

شادی کے بعد وہ لوگ ہنی مون منانے نکل گئے۔ اور جب ڈیڑھ دو مہینے کے بعد وہ 'قصرِ امروز' واپس آئے تو دونوں کے گالوں پر گلاب کھل

رہے تھے ۔ اور سانسیں محبت و خلوص سے معطر معطر سی تھیں ۔ وہ بہت مسرور تھے ۔ بہت خوش تھے ۔ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان کی باہوں میں سمٹ آئی تھیں ۔

ایک صبح امروز کی آنکھ کھلی تو انھوں نے حسبِ عادت اپنا ہاتھ پھیلا کر سیم تن کو اپنی باہوں میں سمیٹنا چاہا ۔ لیکن سیم تن وہاں نہیں تھی ۔ وہ چونک کر بیدار ہو گئے اور سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر جلایا ــــ دو چار کش لیے تو ذہن ذرا صاف ہوا ۔

" شاید سیمیں جلدی اٹھ گئی ہے " انھوں نے سوچا ۔ ملازم بیڈ ٹی لے آیا اور چائے بنا کر انھیں دی ۔ وہ آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ لیتے رہے ۔ کچھ دیر اور بیتی تو وہ بیقرار ہو کر اس کی تلاش میں خود نکل پڑے ۔ راہداری کے دوسرے سرے پر کمرہ سے گھنگھروؤں کی آواز آ رہی تھی ــــ دروازہ کے بھڑے ہوئے پٹ کو انھوں نے آہستہ سے کھولا ــــ سیم تن ریکارڈ پلیئر پر اپنا پسندیدہ ریکارڈ لگائے ایک خوبصورت 'ترانہ' پر رقص کر رہی تھی ۔ وہ بالکل بیخود تھی ۔ امروز کمرہ میں آ گئے لیکن اسے ان کی آمد کا پتہ نہ چلا ۔ چند منٹ وہ اسے رقص کرتے دیکھتے رہے ۔ اس کے متناسب جسم کی ایک ایک جنبش انھیں بیقرار کر رہی تھی ۔ اور پھر انھوں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں لے لیا ۔ اور اس کے ملائم بالوں کے ڈھیر میں اپنا چہرہ چھپا لیا ۔

" سیم ! میری جان ــــ بس کرو ۔ دیکھو نا کیسی پسینے پسینے ہو رہی ہو ؟ "

" اوہ ــــ آپ کب جاگے امروز ؟ "

" بڑی دیر سے جاگ رہا ہوں ــــ اور آپ کو یاد کر رہا ہوں ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ یہاں ہیں "

" اتنے دنوں خوب عیش کیا میں نے ــــ اب سوچ رہی ہوں کہ روزانہ پریکٹس کیا کروں گی ۔ ورنہ جو کچھ سیکھا ہے بھول جاؤں گی "

"اچھا ہے۔ تھوڑی سی ورزش بھی ہو جایا کرے گی۔ اس طرح عیش کرتی رہیں تو بالکل ڈل ہو کر رہ جاؤ گی"۔

امروز اسے سہارا دیئے خواب گاہ میں لے کر آگئے۔ گھنٹی بجا کر ملازم کو بلایا۔ اور اسے پھلوں کا جوس لانے کا حکم دیا۔ سیم تن شوہر کے اس خیال پر نہال ہو گئی۔ ایسا ٹوٹ کر چاہنے والا شریکِ زندگی تو کسی کسی کو ملتا ہے۔ وہ کتنی خوش قسمت ہے۔

اور پھر اس کا معمول سا بن گیا کہ وہ روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹہ رقص کی پریکٹس کرتی اور اس کے بعد اس کا سارا وقت امروز کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں کی نگرانی میں گذر جاتا۔ قصرِ امروز اتنی وسیع اور بھی سجائی کوٹھی تھی کہ روزانہ ڈھیروں کام نکل آتے تھے۔ پھر امروز کو گھر سجانے کا شوق بھی تھا۔ اس لیے سیم تن بھی اس میں دلچسپی لیتی تھی۔ شام کے کئی گھنٹے کلب، اور گھومنے پھرنے میں گذر جاتے تھے۔ امروز اب بھی کلچرل پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ اور جی کھول کر چندہ بھی دیتے تھے۔ اب ان کے ساتھ سیم تن بھی ہوتی تھی۔ خصوصاً رقص و موسیقی کے پروگرام میں وہ اس کو لے کر ضرور جاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سیم تن ان کی کتنی دلدادہ ہے۔ اور سیم تن کی دلجوئی ان کا ایمان بن چکی تھی۔ لیکن یہی وہ لمحات تھے۔ جب سیم تن کو اپنی روح کا رشتہ جسم سے منقطع ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ اسٹیج پر رقص کرتی ہوئی لڑکی کے جسم میں اس کی اپنی روح سرایت کر جاتی تھی ـــ اور پھر وہ اپنا بے جان جسم لیے ـــ اپنی روح کو رقص کرتے دیکھتی رہتی تھی۔ پروگرام ختم ہو جاتا تو اس کی روح اس کے جسم میں دوبارہ داخل ہو جاتی اور وہ ہوش میں آجاتی ـــ روح کے جسم سے بچھڑنے کا کرب اسے بار بار برداشت کرنا پڑتا۔ اور اس کرب سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے ایسے کسی پروگرام میں جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کی روح کی بے چینی پھر بھی کم نہ ہوئی بلکہ بڑھتی ہی رہی۔

سیم تن کی عزیز سہیلی نے بنگالی کلب، کی طرف سے دسہرہ کے موقع پر رقص و موسیقی کا پروگرام پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں اس نے سیم تن کو بھی رقص پیش

کرنے کے لیے مدعو کیا۔ شوما بنرجی کی بات وہ ٹال نہ سکی اور اس نے وعدہ کر لیا۔
ان دنوں امروز چند دن کے لیے باہر گئے تھے۔ واپس آئے تو اخبار میں بنگالی کلب کے پروگرام پر نظر پڑی اور سیم تن کا نام دیکھ کر وہ چونک پڑے۔

"سیم تن۔۔ تم نے یہ پروگرام دیکھا؟"

امروز نے اشتہار دکھا کر پوچھا۔

"جی" سیم تن نے گردن جھکالی۔

"کیا تم سچ مچ ڈانس کرو گی؟"

"ہاں امروز۔۔ شوما بنرجی نے بہت ضد کی، مجبوراً مجھے وعدہ کرنا پڑا۔ دراصل یہ ان کا تہذیبی پروگرام ہے۔ وہ برا مانتی اس لیے میں انکار نہ کر سکی"۔

امروز اس کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ سیم تن کو یہ اندازہ لگانے میں مشکل نہ ہوئی کہ انھیں یہ بات پسند نہ آئی۔ لیکن اس نے بھی دل ہی دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنی برسوں کی ریاضت کو خاک میں نہیں ملنے دے گی۔۔ وہ رقص کو عبادت سمجھتی تھی، عیاشی نہیں۔ پھر امروز تو اس کے اس شوق سے صرف واقف ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ تو اس کے رقص کے شیدائی تھے۔ یہی رقص ان سے ملاپ کا ذریعہ بنا تھا۔ چند مہینے پہلے تک وہ اس کے ڈانس کی کتنی تعریف کرتے تھے۔ پھر اب کیا ہو گیا ہے؟۔

"امروز سوچ رہے تھے۔

"سیم تن نے اچھا نہیں کیا۔۔ اب وہ صرف سیم تن نہیں ہے۔ مسز امروز ہے۔ ایک لکھ پتی اور عزت دار انسان کی شریک حیات۔۔ اسٹیج پر جا کر سیکڑوں تماشائیوں کے سامنے تماشہ بننا اسے زیب نہیں دیتا۔ اس میں اور ایک عام رقاصہ میں بہت فرق ہے۔ اور اسے یہ فرق سمجھنا ہوگا۔ آج نہیں تو کل۔ اسے اپنے اس شوق کو چھوڑنا ہوگا۔ اس کی خاطر۔ اپنی محبت کی خاطر"۔

بنگالی کلب کے پروگرام میں امروز نہیں گئے۔ مصروفیت کا بہانہ کر دیا

سیم تن کا ڈانس بہت پسند کیا گیا۔ تالیوں کی گونج اس کے کانوں میں شہد ٹپکا رہی تھی۔ آٹو گراف دیتے دیتے انگلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ پھر بھی وہ خوش تھی۔ دوسرے دن کے نیوز پیپرس اس کی تصویروں اور تعریف سے بھرے پڑے تھے۔ شاید اس تعریف کے پردے میں امروز کی پوزیشن بھی مدنظر تھی کیونکہ سیم تن اب مسز امروز تھی۔ اور ایک بڑے بزنس مین کی بیوی کی تعریفیں کرنے میں فائدہ ہی تھا۔ یہ ساری باتیں امروز کو بری طرح کھل رہی تھیں۔ اور اس نے طے کر لیا تھا کہ آئندہ ایسا کوئی موقع آیا۔ تو وہ سختی سے انکار کر دے گا۔ سیم تن روٹھے گی۔ تو وہ اسے منالے گا۔ اسے اپنی محبت پر پورا بھروسہ تھا۔

شہر کی مشہور ڈرامہ کمپنی "سب رنگ" نے "شام اودھ" کے نام سے ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ دربار اودھ کی رنگین شاموں کی عکاسی کے لیے کتھک رقص بھی شامل کیے گئے۔ ان کی نظر انتخاب سیم تن پر پڑی اور شہاب میاں قصر امروز جا پہنچے۔ امروز سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے اور سیم تن کئی بار ان کے پروگراموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ اس لیے وہ بے جھجک ان کے پاس چلے گئے۔

شہاب میاں کی بات سن کر امروز نے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں کہا۔

"معاف کیجئے گا شہاب میاں۔ مسز امروز نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب کسی پروگرام میں حصہ نہیں لیں گی" شہاب میاں نے پُرامید نظروں سے سیم تن کو دیکھا تو اس نے گردن جھکالی۔ اثبات یا انکار میں کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے تو سیم تن نے امروز سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ کو انکار کرنا تھا تو کر دیتے۔ میرا نام کیوں لیا آپ نے؟"

"ہم اور تم الگ الگ تو نہیں ہیں جان امروز! اس لیے ہمارے فیصلے بھی الگ نہیں ہو سکتے۔ ہم ایک ہی ہیں پیاری۔ بالکل ایک"

"امروز! معاف کیجئے گا۔ یہاں مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ آپ

اچھی طرح جانتے ہیں کہ رقص میری زندگی کا ایک خاص جزو ہے۔ اسے الگ کر کے میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"کیا رقص مجھ سے اور میری محبت سے زیادہ ہے؟"

"آپ میری ایک عبادت کا دوسری عبادت سے مقابلہ نہ کیجیے امروز! ورنہ فیصلہ کرتے وقت میں بڑی الجھن سے دوچار ہو جاؤں گی۔"

سیم تن وہاں سے چلی گئی اور اپنے بستر پر گر کر دیر تک روتی رہی۔ کتنے مشکل امتحان کی گھڑی آ گئی تھی ___ امروز بار بار اس کے صبر و ضبط کا امتحان لے رہے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ وہ پیدائشی رقاصہ تھی۔ قدم قدم پر اس کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی ___ خود امروز اس کے رقص کے مدّاح تھے۔ لیکن اب ___؟ اب وہ بار بار اسے یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ صرف مسز امروز ہے ___ ماضی کی سیم تن سے اس کا ہر رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ سیم تن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے کہ وہ صرف اور صرف سیم تن ہے۔ ایک نامکمل وجود کب تک باقی رہ سکتا ہے۔ وہ ختم ہو جائے گی۔

سیم تن روتی رہی ___ سسکتی رہی ___ امروز اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ پھر بھی وہ اسے منانے نہیں آئے۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ رو دھو کر دل کا غبار نکل جائے گا ___ اور وہ پھر وہی سیم تن ہو جائے گی۔ ہنستی، مسکراتی، زندگی کی مسرّتوں کی شراب گھونٹ گھونٹ پیتی ہوئی سیم تن ایک دن رقص کو بھول جائے گی۔ بالکل بھول جائے گی ___ یعنی سیم تن ختم ہو جائے گی ___ اور زندہ رہ جائے گی مسز امروز ___ یعنی قصرِ امروز کا ایک بے جان "شو پیس"۔

امروز چند دن تو اس کے نارمل ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ پھر انھوں نے اسے منانے کے لیے ہر جتن کر ڈالا۔ سیر تفریح، شاپنگ، کلب، فلم، پکنک بر دادن آزمایا ___ لیکن سیم تن ایسا بجھی تھی کہ کسی طرح اس میں زندگی کی رمق نہ

پیدا ہو سکی۔ اس کی شوخی، خوش اخلاقی، سب ختم ہو چکی تھی۔ نہ محبت کے اظہار میں کوئی گرمجوشی تھی۔ نہ خلوتوں میں وہ مدہوشی — جس کے امروز گرویدہ تھے — زندگی کی حرارت ہی جیسے ختم ہو گئی تھی — امروز کی محبت بھی کسی ننھی سی چنگاری کو جنم نہ دے سکی اور پھر ایک دن وہ بڑی خاموشی سے امروز کی زندگی سے دور چلی گئی۔

بمبئی سے ایک کلچرل ٹروپ بیرونِ ممالک جا رہا تھا۔ سیم تن کو دعوت نامہ ملا تو اس نے اپنی منظوری دے دی۔ اس کی عرصہ سے خواہش تھی کہ ملک سے باہر جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ اسے معلوم تھا کہ امروز اسے کہیں جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ اس لیے اس نے امروز سے تذکرہ نہیں کیا۔ جاتے وقت اس نے امروز کے نام ایک مختصر سا خط چھوڑ دیا۔

امروز! آج سے ہمارے راستے جدا ہو رہے ہیں۔ میں جا رہی ہوں — ہمیشہ کے لیے۔ فقط

سیم تن

سیم تن چلی گئی — اور پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ بمبئی میں بس گئی۔ اور پھر بہت جلد اس نے فلموں میں اپنی جگہ بنا لی۔ وہ خوبصورت تھی، جوان تھی، کتھک کی بہت اچھی رقاصہ تھی۔ اس لیے اسے فلموں میں بہت ترقی ملی۔ اس نے کبھی امروز کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی، اسے اپنی مصروفیتوں میں امروز کے بارے میں سوچنے تک کی فرصت نہیں تھی۔ وہ اسے بھول چکی تھی — یکسر فراموش کر چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سیلاب زدوں کی امداد کے لیے ایک خصوصی پروگرام میں شرکت کرنے کے لیے اسے مدعو کیا گیا تو اسے امروز کا خیال تک نہیں آیا۔ لیکن۔ جلترنگ' میں قدم رکھتے ہی اسے بھولی بسری یادیں تڑپانے لگیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل جلترنگ' دراصل قصرِ امروز تھا۔ یہاں کا چپہ چپہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ قدم قدم پر ماضی کی پرچھائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے در و بام اس کی محبت

کے گواہ تھے۔

"امروز کہاں گئے؟"۔۔۔

"قصرِ امروز! فائیو اسٹارز ہوٹل کیسے بن گیا؟"۔

وہ کس سے پوچھتی؟۔۔ امروز مل بھی جاتے تو ان کا رویّہ اس کے ساتھ کیسا ہوتا۔؟۔۔"

وہ اس سے سخت ناراض ہوں گے۔ جب ہی تو اسے منانے کی کوشش نہیں کی۔ پھر سیما سے ان کا کوئی رشتہ بھی تو نہیں ہے۔ اور امروز کی سیم تن تو اس دن مر گئی تھی جس دن وہ امروز کی زندگی سے گئی تھی۔۔۔

سیما اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ 'کاپموز' کی کئی گولیاں کھا چکی تھی۔۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ امروز کی یاد اسے پل پل بے قرار کر رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے امروز کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ بے انصافی کی ہے۔ دنیا آج اس کے فن کی شیدائی ہے۔۔ لیکن۔۔۔ "ہمارے تابکے"۔۔ جب اس کی جوانی ڈھل جائے گی، رنگ روپ اتر جائے گا۔ تب اس کے فن کے شیدائی کہاں ہوں گے۔؟

روپ اور جوانی کی دھوپ ایک دن شبِ تاریک میں بدل جائے گی۔ تب اس کے فن کی نعش کو "۔۔۔ یادوں کی ممی" بنا کر "ماضی کے مقبرہ" میں بند کر دیا جائے گا۔۔۔ اس کی شہرت قصۂ پارینہ بن جائے گی، فن کی عبادت کرنے والی سیم تن کی کوئی پرستش نہیں کرے گا۔ جو اس کی پرستش کرتا تھا۔ اسے اس نے خود چھوڑ دیا۔ ایک پل کی جنت کے لیے ساری زندگی کا جہنم اس نے پسند کیا۔ وہ کتنی احمق تھی۔ کتنی نادان تھی۔

سیم تن گھبرا کر بستر سے نیچے اتری۔ پیروں میں مخملیں سلیپر پہن کر وہ دبے پاؤں نیچے آگئی۔ لان کے ایک تاریک گوشے میں وہ نرم گھاس پر لیٹ رہی۔ چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔ سائیں سائیں کرتے ہوئے وسیع لان میں وہ

تنہا اور اداس لیٹی تھی — یہ سناٹے اس کے دل میں اتر آئے تھے۔ ان سناٹوں کی گونج اسے اپنی روح میں سنائی دے رہی تھی۔ وہ کتنی اکیلی تھی — ؟ کتنی اداس تھی — ؟ کوئی بھی تو اس کا نہیں تھا۔ کسی "اپنے" کے لیے وہ کتنا تڑپ رہی تھی۔ امروز — امروز — کہاں ہو تم — ؟"

"سیم تن میں تمھارے پاس ہوں —"

امروز کی پیار بھری سرگوشی ابھری۔ وہ چونک پڑی — امروز اس کے پاس تھے۔ بالکل قریب — وہ اچانک امروز کو پاکر خوشی سے بیخود ہو گئی — اور اس نے اپنی بانہیں امروز کے گلے میں حمائل کر دیں —

" امروز — امروز — آئی لو یو — تمھارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی امروز — مجھے اپنے ساتھ لے چلو — یہاں سے دور — بہت دور — جہاں بس ہم دونوں ہوں — ہماری محبت ہو — اور — اور امروز — گھنگھروں کی جھنکار کے بجائے — ہمارے ننھے منے بچوں کی مترنم آوازیں ہوں —"

سیم تن جھٹکے سے اٹھی — اور امروز کے بازو کے سہارے وہ لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی بڑھتی گئی — پھر — گہری دھند نے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

دوسری صبح "جلترنگ" کے سوئمنگ پول سے سیم تن کی نعش نکلی تو سارے ہوٹل میں قیامت آگئی۔ "جلترنگ" کے مالک بھی حادثہ کی اطلاع پاکر آگئے۔ پولیس موقع پر پہنچ چکی تھی۔ اور ابتدائی کارروائی میں مصروف تھی۔

"سیم تن! — برسوں کے انتظار کے بعد یہ گھڑی آئی تھی۔ اور میں نے تمھارے استقبال کی اسی طرح تیاری کی تھی — جیسے پہلی بار قصر امروز میں تمھارے دلہن بن کر آنے پر کی تھی۔ لیکن — تم نے صبح ہوتے سے پہلے ہی "در توبہ" بند کر دیا۔

سب نے حیرت سے دیکھا — "جلترنگ" کے مالک مسٹر امروز نے جھک کر نعش کے ٹھنڈے ٹھنڈے ہونٹوں کا بوسہ لیا — اور تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے

———

قرض

آبگینہ نے خطوط کے انبار پر نظر ڈالی۔ یہ وہ خطوط تھے جو اس کے بابا کے انتقال پر تعزیت کے اظہار کے لیے آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے بابا کتنے ہر دلعزیز تھے۔ کچھ خطوں میں اس سے بے پناہ ہمدردی کا اظہار بڑے موثر انداز میں کیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ اس کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو، فوراً انھیں لکھے۔ کسی نے تحریر کیا تھا کہ خدانخواستہ اس پر کوئی وقت پڑا، تو وہ اس کی ہر ممکن مدد کریں گے وغیرہ۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ جس چیز کی اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ کوئی بھی شخص اسے نہیں دے سکتا تھا۔ اور وہ چیز تھی، شفقت اور محبت۔ سرپرستی اور ایک مضبوط سہارا جو صرف ایک باپ ہی اپنی بیٹی کو دے سکتا ہے۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان میں سے کتنے ہی لوگ اس کے بابا کے مقروض تھے۔ یہ قرض مختلف صورتوں میں تھا۔ اس میں ان کی فیسوں اور کتابوں ...

کھانے پینے اور کپڑے لتے تک کا خرچ شامل تھا۔ اس کے بابا نے کبھی ان باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے بابا پروفیسر تھے۔ بے حد عالم و فاضل۔ اور اپنے علم کی دولت انھوں نے بے دریغ اپنے شاگردوں پر خرچ کی تھی۔ آج ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے جو ملک کی مختلف درس گاہوں میں لیکچرر تھے۔ ریڈر اور پروفیسر تھے۔ کتنے ہی بیرونِ ممالک میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ وہ چاہتے تو اس قرض کو کسی صورت میں چکا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی بابا کو ایک خط تک نہ لکھا۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ آج وہ جو کچھ ہیں پروفیسر رحمان کی کوششوں سے بنے ہیں لیکن آج کا انسان اتنا بے ضمیر ہو چکا ہے کہ کسی کا احسان یاد نہیں رکھتا۔

ملازم نے کسی صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ آج کل تو روزانہ ہی آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ وہی رسمی جملے، وہی گھسی پٹی باتیں — وہ تو اکتا سی گئی تھی۔ لیکن دنیاداری تو بہرحال نبھانا ہی تھی۔

وہ سست قدموں سے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی ایک ناآشنا صورت اس کے سامنے تھی۔ ساٹھ باسٹھ کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ اسے دیکھ کر نووارد اس کے نزدیک آیا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا!

"بیٹی! میں رحمان کا گناہگار ہوں کہ ایسے وقت آیا جب وہ اس دنیا سے جا چکا ہے۔ کاش میں اس کی زندگی میں ہی آگیا ہوتا۔"

آبگینہ سسک اٹھی۔ کتنا اپنا پن تھا اس انداز میں — نووارد اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ اس کا سر چوم رہا تھا اور اس کی زبان سے تسلی کا ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ بے آواز رو رہا تھا اور اس کو اس طرح لپٹائے ہوئے تھا جیسے بابا اس کی بے چینی اور تڑپ سے بیقرار ہو کر واپس آگئے ہوں۔

"بیٹی رو رو کر ہلکان نہ ہو، آرام سے بیٹھ کر باتیں کرو۔ تم تو بڑی سمجھدار

بجتی معلوم ہوتی ہو۔ زیادہ رونے سے چاہنے والے کی روح اور بھی بیقرار ہوگی۔
آبگینہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

" مجھے تو رحمان کی موت کی خبر بھی نہ ملتی۔ اخبار میں ماتم پرسی کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تم نے جو مراسلہ شائع کرایا تھا۔ اس سے علم ہوا۔ اسی سے تمھارا نام پتہ بھی معلوم ہوا۔ ورنہ میں تو برسوں سے رحمان کے بارے میں لاعلم تھا بیرونِ ملک رہنے کی وجہ سے اور بھی زیادہ دوری اور لاتعلقی پیدا ہوگئی تھی۔"

" چچا جان ! ۔ مجھے آپ اپنا نام بتایئے بابا ضرور آپ کا ذکر کرتے ہوں گے۔"
آبگینہ ان کی شفقت اور محبت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

" بیٹی ، وہ بہت شریف انسان تھا۔ وہ کبھی ان لوگوں کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ جو اس کے مقروض تھے۔ اس کے کردار کے اس پہلو سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے اختر علی کہتے ہیں۔ وہ میرا اتنا عزیز دوست تھا کہ ۔۔۔"

اختر علی کی آواز رندھ گئی اور وہ خاموش ہوگئے۔ آبگینہ ان کی دلدہی کی خاطر کہنے لگی۔

" چچا جان ۔۔ بابا نے تو کبھی کسی قرض کا ذکر نہیں کیا۔ شاید وہ بہت چھوٹی سی رقم ہوگی جسے انھوں نے کبھی قابلِ ذکر نہ سمجھا۔ ہوسکتا ہے وہ بھول چکے ہوں۔ پھر آپ اس کے لیے آزردہ کیوں ہوتے ہیں۔ ؟"۔۔

" حالانکہ وہ رقم سود در سود اتنی بڑھ چکی ہے کہ میں چاہوں بھی تو ادا نہیں کر پاؤں گا۔"۔

اختر علی رو ہانسے ہو رہے تھے۔

" آپ اس کو بھول جایئے چچا جان"۔۔

" کیسے بھول جاؤں ؟ ۔۔ اس کے اس قرض نے ہی میری زندگی بدل دی تھی۔ اگر وہ میرے اوپر اس وقت یہ احسان نہ کرتا۔ تو خدا جانے میرا کیا ہوتا تاہم اتنا تو یقین ہے کہ میں وہ قطعی نہ بن سکتا جو آج ہوں "۔

اختر علی دیر تک آبگینہ سے باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو انھیں پتہ چلا کہ پروفیسر رحمان نے نہ تو کوئی خاطر خواہ رقم چھوڑی ہے اور نہ کوئی قابلِ ذکر اثاثہ۔۔۔ مکان بھی ذاتی نہیں کرائے کا ہے۔ وہ کہنے لگے۔

" بیٹی! مجھے یہ سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ وہ شروع سے ہی فراخدل اور ہمدرد تھا۔ دوسروں کی پریشانیوں کو اپنی پریشانی سمجھتا تھا اور انھیں دور کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا تھا۔ جو لوگ اسے نہیں سمجھتے وہ اس پر لعن طعن کریں گے۔ جو اس کے کردار سے واقف ہیں وہ اس کی عزت کریں گے۔ اپنے لئے تو سب ہی جیتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ دوسروں کے لیے جیا "۔

" امی ان سے اسی لیے ناراض رہتی تھیں۔ لیکن وہ ان کو بہلا پھسلا کر اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے "۔

" اس کے والدین بھی ہمیشہ اس سے ناراض رہے۔ ان کی دانست میں وہ ایک بگڑا ہوا اور باغی لڑکا تھا، ناخلف اور نافرمان تھا۔ لیکن اس نے کتنے ہی لوگوں کو جینے کا سلیقہ سکھایا تھا اور کتنوں کی زندگی سنواری ۔۔۔ اور جب اس کا وقت آیا۔۔ تو سب نے اس سے منھ پھیر لیا "۔

اختر علی، پروفیسر رحمان کے متعلق چھوٹی بڑی باتیں اسے بتاتے رہے اور اپنے بابا کی تعریف سن کر اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ کتنے اونچے آدرش تھے بابا کے۔۔

" بیٹی ۔۔ سچ پوچھو تو میں تم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ میں تم کو یہاں تنہا نہیں رہنے دوں گا۔ تم دو دن کے اندر تیاری کر لو۔ پھر ہم اپنے گھر چلیں گے "۔

" لیکن چچا جان ! "

آبگینہ نے کچھ کہنا چاہا۔

" لیکن کیا ؟ ۔۔۔ کیا تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے ؟ "۔

" یہ بات نہیں ہے چچا جان - میں آپ کے اوپر بوجھ "
" ٹھیک ہے بیٹی ! - بوجھ ہی سہی - جس طرح نیرّہ میرے اوپر بوجھ ہے - اسی طرح تم بھی ہو "

اور پھر وہ اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاتے رہے —— بیوی بہت اچھے مزاج کی ہیں - بہت محبت کرنے والی سیدھی سادی خاتون ہیں - بڑا لڑکا احمد ڈاکٹر ہے - اس سے چھوٹی عارفہ ہے - اس کی شادی ہوگئی - نیرّہ بی - اے فائنل میں ہے وغیرہ وغیرہ -

آبگینہ نے غور کیا تو اسے اختر علی کی رائے سے متفق ہونا پڑا - وہ ایم اے کر چکی تھی - ایک اعتبار سے اس کی تعلیم ختم ہو چکی تھی اور جس طرح وہ یہاں اسکول میں سروس کر رہی تھی - اس طرح وہاں بھی سروس کر سکتی تھی - اس طرح اس کا وقت بھی اچھا کٹے گا —— اور وہ اپنے محسنوں پر بوجھ بھی نہیں رہے گی "

اختر علی اسے لے کر گھر پہنچے تو بیگم نے اس کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا نیرّہ نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا - عارفہ اپنی سسرال میں دوسرے شہر میں رہتی تھی - البتہ ڈاکٹر بیٹے سے ملاقات نہ ہو سکی - یا تو انھوں نے اس کی آمد کا جان بوجھ کر کوئی نوٹس نہ لیا - یا واقعی وہ اس قدر مصروف تھے کہ ملاقات کا وقت نہیں ملا - ان کے ناشتے اور کھانے کے اوقات بھی الگ تھے - آتے جاتے ان کی جھلک دیکھ کر وہ خود ہی چھپ جاتی تھی - کچھ ان کے برتاؤ سے اسے اپنے ناخواندہ مہمان ہونے کا احساس بھی ہو چلا تھا -

ایک دن اس نے دبی زبان سے اپنی ملازمت کا ذکر کیا تو وہ چونک پڑے -
" —— ملازمت کا خیال تمھارے دل میں کیسے آیا آبگینہ ؟ - کیا یہاں تمھیں کوئی تکلیف ہے ؟ - یا خود کو غیر سمجھتی ہو ؟ ——

"بخدا ایسا نہیں ہے چچا جان ۔۔۔ بس پڑے پڑے میرا جی گھبراتا ہے۔ اس لیے سوچا کہ کہیں ۔"

"اوہ بس اتنی سی بات ہے۔ گھر میں ڈھیروں کام ہیں۔ لان درست کرو۔ کڑھائی سلائی کرو۔ نیرہ کے ساتھ گپ شپ کرو۔ بس ملازمت کا نام نہ لو۔"

وہ دل مار کر رہ گئی۔ لیکن احمر کے رویے سے دل پر جو بوجھ سا آگرا تھا۔ وہ نہ دور ہو سکا۔

"ایک دن چچی جان اس کے پاس آئیں اور بڑی شفقت سے کہنے لگیں۔

"بیٹی! تمھارے چچا جان تمھارے والد سے لیا ہوا قرض ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں تمھاری رضامندی کی ضرورت ہے۔"

"چچی جان! ۔۔ میں پہلے بھی چچا جان سے کہہ چکی ہوں۔ اور آج پھر دست بستہ عرض کرتی ہوں کہ خدارا آپ لوگ اس قرض کو بھول جائیں۔ مجھے اس لفظ سے تکلیف ہوتی ہے۔"

"۔۔۔۔۔ واقعی تم رحمان کی جیتی جاگتی تصویر ہو ۔۔ ویسی ہی ہمدرد اور فراخ دل ہو۔ خدا انھیں سلامت رکھے ۔۔ اچھا کم از کم ہمیں اس بات کی اجازت تو دے دو کہ تمھارے مستقبل کے لیے ہم اپنی خوشی سے کوئی فیصلہ کر سکیں۔"

"۔۔ آپ کے اور چچا جان کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو کسی امر میں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا حکم میرے لیے فرمانِ الٰہی سے کم نہیں ہے۔"

"ہم نے احمر کو تمھارا شریکِ زندگی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ خدا کرے تم دونوں خوشگوار ازدواجی زندگی گزارو۔ بس انشاء اللہ اگلے ہفتے یہ مبارک تقریب منعقد ہوگی۔"

چچی جان اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلی گئیں اور وہ منھ کھولے حیرت سے

اس دروازہ کو دیکھتی رہ گئی جس سے نکل کر وہ ابھی گئی تھیں۔

اسے ان کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

خوب دھوم دھام سے شادی ہوئی اور جن احمر کو وہ بدمزاج، مغرور اور نہ جانے کیا کیا سمجھتی تھی۔۔۔ وہ اتنے اچھے اور محبت کرنے والے شوہر ثابت ہوئے کہ اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔۔۔ ساری بدگمانیاں دور ہوگئیں۔

ایک رات وہ احمر کے بازو پر سر رکھے ان کی دلچسپ باتوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک کچھ یاد آجانے پر چونک پڑی۔

" احمر! چچاجان بار بار کسی قرض کا تذکرہ کرتے ہیں۔۔۔ آپ کو پتہ ہے آخر انھوں نے بابا سے کتنی رقم قرض ... لی تھی "۔

" تمھارے بابا نے تو اپنی متاعِ حیات ہی انھیں ہنسی خوشی دے ڈالی تھی۔۔۔"

احمر نے ہنس کر کہا۔۔۔

" میں سمجھی نہیں۔۔"

" دراصل میری امی تمھارے بابا کی منگیتر تھیں اور وہ ان کو چاہتے بھی بہت تھے۔ لیکن امی اور ابو ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے ادھر ابو اور بابا بھی گہرے دوست تھے۔ جب شادی کی بات چلی تو ابو نے تمھارے بابا کو ساری بات بتادی۔ اور انھوں نے خود ہی اس شادی سے انکار کر دیا۔ خاندان والوں نے بہت لعن طعن کی۔ بچپن کی منگنی توڑنا اس وقت ایک ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا تھا۔ حد یہ ہوئی کہ بابا کے والدین نے انھیں جائداد سے بھی محروم کر دیا۔ لیکن ان کے فیصلے میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ اور پھر جب ابو کا پیغام گیا۔۔۔ تو بادلِ نخواستہ امی کے گھر والوں نے ان کا رشتہ قبول کر لیا۔۔

یہی وہ قرض تھا جس کا تذکرہ ابو بار بار کرتے ہیں۔

"اوہ! — مگر آپ کا اس ڈرامہ میں کیا رول رہا جناب؟ —
آبگینہ نے ہنس کر شرارت سے پوچھا —

"سرکار! میں تو اس قرض کی پہلی قسط کے طور پر آپ کو بخشا گیا ہوں۔
انشاء اللہ باقی قسطیں بھی جلد ادا کر دی جائیں گی — ہاں — دوسری قسط
کے طور پر آپ کیا لینا پسند کریں گی —؟
اور آبگینہ نے شرما کر احمر کے سینے میں منہ چھپا لیا —

نامحرم

بلجیم گلاس کی مانند جھل جھل کرتا بدن، جوہی کی ڈالی جیسا نرم و نازک سراپا۔ موزوں ناک نقشہ، طبیعت میں نزاکت و نفاست۔ ناز اور تمکنت کا دل نشیں پیکر۔ یہ تھیں ـــ جناب دلھن ـــ جن کی کٹی پھٹی نعش ان کے سامنے اسٹریچر پر رکھی تھی۔ بے جان جسم سے اب بھی جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد نعش ان کے حوالے کی گئی تھی۔ کیونکہ وہی ان کے جائز اور قانونی وارث تھے۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ اب اس کا کیا کریں؟ ایک بار جی میں آئی کہ اس بے جان جسم کو سینے سے لگا کر پیار کرلیں۔ لیکن کیا ایسا کرنا ٹھیک ہوگا؟ زندگی میں کبھی انھوں نے ان کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔ تو اب مرنے کے بعد کیوں ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں۔؟

ان کی یہ حالت دیکھ کر یوسف میاں کے سینے میں چیخیں گھٹ رہی تھیں اور کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ برسوں کے اختلاف اور جذباتی کشمکش کے باوجود

انھوں نے مہتاب دلھن کا انجام یہ نہیں سوچا تھا۔

یوسف میاں سے وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ وہ اس کمرے سے باہر نکل آئے اپنے پرائے سب کی ملامت آمیز نظروں سے بچتے ہوئے وہ ایک سنسان گوشہ کی سمت بڑھ گئے۔

مہتاب دلھن کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اور وہ جو بظاہر ان کی موت کے ذمے دار تھے۔ سوچ رہے تھے کہ قصور دراصل کس کا تھا۔ ؟ ان کا ؟ ۔ یا خود مہتاب دلھن کا ؟ ۔ یا ان حالات کا جنھوں نے مہتاب دلھن کی رہنمائی اس انجام تک کی ؟ ۔

نو بیگم بیاہ کر سسرال آئیں تو انھیں مہتاب دلھن کا خطاب ملا۔ ان کی خوبصورتی اور رکھ رکھاؤ نے انھیں جلد ہی ہر دلعزیز بنا دیا۔

ساڑھے چھ فٹ کے اونچے اور لیم شیم یوسف میاں ان کے سپنوں کے شہزادے کے برعکس اتنے بدصورت اور بے ڈھنگم تھے کہ وہ انھیں اپنے قرب کی سعادت سے سرفراز نہ کرسکیں۔ وہ پہلی ہی رات ان کے بھاری بھرکم ہاتھوں میں ایسا تڑپیں، پھڑپھڑائیں ۔ جیسے آسمان کی بلندیوں میں اڑتے ہوئے اچانک ننھی سی کبوتری کسی ظالم اور خوں خوار بہری کے پنجوں کی گرفت میں آکر پھڑپھڑاتی ہے۔

یوسف میاں نے یہ بات سب سے چھپا ڈالی۔ لیکن وہ اتنی اہم بات کو خود اپنے آپ سے نہ چھپا سکے۔ ان کے اندر کا مرد انھیں ہر پل، ہر لمحہ ملامت کرتا رہتا تھا۔ جب ان کے اندر کے چھپے مرد کے تقاضے انھیں زیادہ پریشان کرنے لگے تو وہ بمبئی چلے گئے۔ جہاں ان کا کاروبار تھا ۔ اپنی کاروباری مصروفیتوں میں انھوں نے سب کچھ بھول جانا چاہا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ جب وہ نرم و نازک سی مہتاب دلھن کو رام کرنے میں ناکام رہے تھے۔ تو ایک لمبے چوڑے آہنی مرد کو کیسے قابو میں کر سکتے تھے۔

تھک ہار کر انھوں نے فیروزہ کو اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا۔ وہ ایک سیدھی سادی، غریب پارسی لڑکی تھی۔ اگلی بار جب وہ گھر گئے تو فیروزہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ جناب ذھن نے کسی جذباتی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ اپنے کمرہ میں لیٹی کتابیں اور رسالے پڑھتی رہتی تھیں۔ یا پھر اپنی خالہ زاد بہن نفاست آرا کے پاس چلی جاتی تھیں۔ جن کا گھر نزدیک ہی تھا۔

نفاست نے فیروزہ کو دیکھ کر ناگواری کا اظہار کیا۔

"دولھا بھائی محض تم کو جلانے کے لیے اس عورت کو لائے ہیں۔"

"میری جلے بیزار — وہ ایک نہیں دس عورتیں لے آئیں۔"

"حوری! اس طرح تمھاری زندگی کیسے گزرے گی؟"

"کسی طرح گذر ہی جائے گی۔"

"تم ان سے طلاق لے لو۔" نفاست نے رائے دی۔

"میری گھر والوں کی ناک اتنی لمبی ہے کہ طلاق کی قینچی اسے پل میں کاٹ دے گی۔"

کیا سب کی ناکیں بچانے کے لیے تم اپنی ساری زندگی بھینٹ چڑھا دو گی —؟ اگر کسی نادانی میں آکر تم نے اپنی ہی شہ رگ کاٹ ڈالی — تو کیا ہو گا —؟"

"پھر کیا کروں نفاست؟" —

"حالات سے سمجھوتہ کر لو، حور بیگم — دولھا بھائی سے مصالحت کر لو — ایسی عورتیں تو موسمی بخار کی مانند ہوتی ہیں۔ ان کا اثر ختم ہوتے کتنی دیر لگتی ہے؟"

"میں جانتی ہوں — لیکن اپنے دل کی خواہش کے خلاف میں کچھ نہیں کر سکتی۔ ان کا خیال تو ایسا ہی ہے جیسے موت کا تصور —"

نفاست ان کی باتیں سن کر چپ ہو گئی اور وہ اس کے متعلق سوچنے لگیں — کتنی اچھی زندگی ہے اس کی — چاہنے والا شوہر — پھول جیسے بچے۔

اور جنت سماں گھر ۔۔۔ کبھی کبھی تو ضمیر میاں ان کے سامنے ہی نفاست سے اظہارِ محبت کر بیٹھتے تھے ۔ اور وہ شرم سے کٹ کر رہ جاتی تھیں ۔ نفاست انھیں آنکھوں آنکھوں میں تنبیہ کرتی ۔ تو وہ الٹا اسے قائل کرنے لگتے کہ بھئی سب ہی میاں بیوی ۔۔۔ اور حور وہاں سے ٹل جاتی تو نفاست انھیں اچھی طرح جھاڑ پلاتی ۔

ضمیر کو حور کی زندگی کے المیہ کا پتہ چلا تو انھیں بہت دکھ ہوا ۔ اتنی پیاری سی اور چاہے جانے کے قابل لڑکی اور اسی روکھی پھیکی ، بے رس زندگی؟ اب ان کی ساری ہمدردیاں حور بیگم کے ساتھ تھیں ۔ جس کا اظہار وہ نفاست کے سامنے کھل کر کیا کرتے تھے ۔ آخر وہ حور بیگم کی بہن تھی ۔ صرف بہن ہی نہیں ۔۔۔ غم گسار دوست بھی تھی ۔

کوئی بھی بات جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو تکلیف دہ ہو جاتی ہے ۔ نفاست کو بھی ضمیر کی ہمدردی کھلنے لگی اور وہ ان کو روکنے ٹوکنے لگی ۔ اس نے خود بھی حور کے گھر آنا جانا کم کر دیا ۔ لیکن اس کی کمی ضمیر نے پوری کر دی ۔ وہ روزانہ ان کے گھر جاتے ۔ اور گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے ۔ دیر ہو جاتی تو حور انھیں کھانے کے لیے روک لیتیں ۔ ان کی پر مذاق باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہ چلتا ۔

حور روزانہ ان کی منتظر رہتیں ۔ اگر کسی دن کسی وجہ سے وہ نہ آتے تو حور وقت کاٹے نہ کٹتا ۔ اور وہ سارے دن کمروں اور دالانوں میں بولائی بولائی پھرتیں ۔۔۔ خدا جانے کس نے ضمیر کی آمد و رفت کے بارے میں یوسف میاں تک خبر کر دی ۔ اور ایک دن وہ اچانک آدھمکے ۔۔۔ ضمیر حسب معمول آئے تو یوسف میاں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی ۔ وہ ان سے تپاک سے ملے ۔ ذرا دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے ضمیر حور بیگم سے ملے بغیر ہی چلے گئے ۔ جتنے دن یوسف میاں رہے ۔ ضمیر کم ہی حور کے یہاں آئے ۔ نفاست نے بھی چین کی سانس

ی۔ عرصے سے جو وسوسے اسے پریشان رکھتے تھے۔ ان میں کچھ کمی ہوگئی۔ البتہ مہتاب دلھن کو ضمیر میاں کی غیر حاضری بہت کھلتی تھی۔ رفتہ رفتہ ضمیر ان کی ضرورت بن چکے تھے — جس کا احساس انھیں اب ہو رہا تھا۔

بمبئی جانے سے پہلے یوسف میاں نے ایک دن مہتاب دلھن سے نرمی اور شائستگی سے کہا۔

بیگم! ضمیر بھائی کا یہاں آنا جانا مناسب نہیں ہے۔ لوگ الٹی سیدھی باتیں بناتے ہیں۔

"آپ سے ان لوگوں نے فیروزہ کے متعلق کچھ نہیں پوچھا" — ؟"۔

"نہیں ورنہ — میں انھیں اس کی وجہ بھی ضرور بتا دیتا" —

"میرے سر الزام تھوپ کر آپ کے عیب ہنر میں نہیں بدل جائیں گے"

مہتاب دلھن نے تڑپ کر کہا۔

"سوچو تو ذرا بیگم — میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ ؟ کیا میں پاگل ہوں — کہ — کر — "۔ —

وہ ان سے صاف صاف نہ کہہ سکے کہ یہ سب میں تمھاری ہی وجہ سے کر رہا ہوں۔ لیکن وہ بغیر کہے ہی سمجھ گئیں "۔

یوسف میاں واپس چلے گئے اور مارے جھلاہٹ اور کھسیانے پن کے انھوں نے سروری کو بھی ملازم رکھ لیا کہ شاید دو عورتیں مل کر خود بیگم کی کمی کو پورا کر سکیں۔

سروری نے ایک لڑکے کو جنم دیا — فیروزہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ یوں یوسف میاں اولاد والے بھی ہو گئے۔ مہتاب دلھن کو بھی یہ خبر ملی اور وہ تڑپ اٹھیں — یوں تو وہ یوسف میاں کو جوتی کی نوک پر مارتی تھیں۔

لیکن ایک عورت ان کے اندر بھی بستی تھی۔ جو اس زیادتی کو برداشت نہ کر سکی
مہتاب دلھن یوسف میاں کو شوہر ماننے سے انکار کرتی تھیں۔ لیکن یہ عورت
اس حقیقت کو فراموش کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ بلا شرکت یوسف میاں
کی مالک ہے۔ ان دنوں وہ حسد کی آگ میں بری طرح جل رہی تھیں اور ضمیر ان کی
اس کیفیت سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ اس آگ کو اور ہوا دے رہے
تھے اور ایک دن حسد کی یہ چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی۔

مہتاب دلھن کا دامن کتنا جلا کتنا باقی بچا ــــ بچا بھی یا سب کچھ جل کر
ختم ہو گیا۔! ــ اس کا حساب اس وقت کون لگاتا ـ ؟

پہلی بار مہتاب دلھن کو صبح صبح الٹی ہوئی تو ان کا جی دھک سے رہ گیا۔
ان کا ہاتھ بے اختیار اپنے پیٹ پر چلا گیا۔ لیکن کہیں کچھ نہ تھا۔ شاید موسم کا اثر
ہو ــــ انھوں نے خود کو بہلانا چاہا۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ ان کی
طبیعت زیادہ خراب ہوتی گئی۔ وہ پریشان رہنے لگیں ــــ اور ایک دن انھوں
نے ضمیر سے کہا۔

" خدا کے لیے کچھ کیجیے ضمیر ــــ مجھے اب پورا یقین ہو گیا ہے کہ .."

مہتاب دلھن نے ڈر کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

" حور ! ــ دن اتنے زیادہ ہو چکے ہیں کہ اب کچھ کرنا خطرے سے خالی
نہیں ہے۔ اور اس میں بدنامی کا بھی اندیشہ ہے "

" پھر کیا کیا جائے ؟ "

" ایک ترکیب ہے، تم کچھ دن کے لیے یوسف میاں کے پاس چلی
جاؤ۔ بے چارے یوسف کی دلی مراد بر آئے گی " ــــ

" آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کا گناہ چھپانے کے لیے اپنی انا اور خودداری
کا جنازہ نکال دوں ۔ ؟ " ــــــ اس آدمی کے قدموں میں جا گروں جس سے
میں دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی ہوں۔ ؟ میں جان دے سکتی ہوں لیکن

یوسف میاں کے آگے نہیں جھک سکتی ۔"

" پاگل نہ بنو حُور! اگر مصلحت سے عزت بچ جائے تو اسے جھکنا نہیں کہیں گے ۔ پھر وہ تمھارے شوہر ہیں ۔"

" رہنے دیجئے اپنی نصیحتیں ۔ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے ۔ تو مجھے زہر لادیجئے ۔"

حُور رو دیں ۔

" حُور! سوجھ بوجھ سے کام لو ۔"

ضمیر نے سمجھانا چاہا ۔ لیکن حور روتی رہیں ۔ اور ضمیر چپ چاپ اٹھ کر چلے گئے ۔

ضمیر جانتے تھے کہ کسی ڈاکٹر سے بات کرنے میں اور حُور کو اس مصیبت سے نجات دلانے میں سو سو خطرے ہیں ۔ بات کھل گئی تو اُن کی عزت خطرے میں پڑ جائے گی ۔ نفاست تو یوں بھی ان پر شک کرتی رہتی ہیں ۔ انھیں ذرا بھی سُن گُن مل گئی تو قیامت ڈھا دیں گی ۔ اس لیے اس مصیبت سے الگ رہنا ہی بہتر ہے ۔ پھر جو کچھ ہوا، اس کے ذمے دار تنہا وہی تو نہیں ہیں ۔ حُور بھی تو برابر کی شریک ہیں ۔

یہ سوچ کر انھوں نے مہتاب دلھن کے گھر جانا بند کر دیا ۔ مہتاب دلھن ان کی اس کنارہ کشی سے گھبرا گئیں ۔ انھوں نے ملازم کو بھیج کر ضمیر کو بلوایا ۔ لیکن ان کی جگہ نفاست آگئی ۔ نفاست ان کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی ۔

" کیسی طبیعت ہے حُوری ؟"

" ٹھیک ہے ۔"

" کیا ٹھیک ہے ۔ ؟ ۔ کسی ڈاکٹر کو دکھایا ۔ یا صبر کیے روگ پال رہی ہو ؟"

"ٹھیک ہو جاؤں گی"۔

وہ تو اپنی جان سے بیزار تھیں۔

جہاں دلھن تو جیسے نفاست کی عدالت میں اس وقت مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی اپنی فردِ جرم سن رہی تھیں ۔۔۔ تجربہ کار نفاست بھانپ گئیں کہ ضمیر کی ہمدردیاں آخر رنگ لے ہی آئیں۔ اسے دونوں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ پھر جوری کی حالت پر ترس آ گیا ۔۔۔ بڑی محبت سے کہنے لگیں۔

"چلو میرے ساتھ ۔۔۔ میں تمھیں ڈاکٹر کو دکھاؤں گی ۔۔۔ اس طرح تو تم مر جاؤ گی حُور"۔

"میرا مر جانا ہی اچھا ہے نفاست"۔

وہ سسک اٹھیں ۔۔۔

لیکن میں تمھیں مرنے نہیں دوں گی ۔۔۔ حُور ۔۔۔ میں تم کو ابھی ساتھ لے جا کر ڈاکٹر کو دکھاؤں گی"۔

"بس آج مجھے معاف کر دو نفاست ۔۔۔ کل جو کہو گی، کروں گی"۔

جہاں دلھن نے لجاجت سے کہا۔ نفاست مان گئی اور چلی گئی۔

اس رات جہاں دلھن آرام کرنے کے لیے اپنی خواب گاہ میں گئیں۔ تو دوسرے روز دن چڑھے تک نہ نکلیں ۔۔۔ ملازمہ نے اندر جا کر انھیں جگانا چاہا۔ لیکن وہ تو بستر پر بے ترتیب پڑی ہچکیاں لے رہی تھیں۔ منھ سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر سفید چادر کو رنگین بنا رہی تھی۔ ملازمہ کی چیخ و پکار پر سب لوگ جمع ہو گئے۔ جہاں دلھن کے گھر والے بھی آ گئے ۔۔۔ ان کے بھائی نے یوسف میاں کو ٹرنک کال کر کے حور بیگم کی حالت بتائی۔

جہاں دلھن، موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ جب یوسف میاں ہوائی جہاز سے پہنچے ۔۔۔ تو وہ ختم ہو چکی تھیں۔

ان کی نعش پوسٹ مارٹم کے لیے جا چکی تھی۔ ان کی موت کی خبر ہواؤں کے دوش پر

اڑ کر چاروں طرف پھیل گئی ۔۔ ان ہی ہواؤں نے جو سرگوشیاں یوسف میاں کے کانوں تک پہنچائیں ۔۔ ان کا مطلب یہی تھا کہ عیاش اور بدکردار میاں نے دُودُو سوتیں سر پر بٹھادی تھیں ۔۔ آخر غریب نے کچھ کھا کر جان دے دی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یوسف میاں نے خود ہی حاصل کی۔ کیوں کہ وہی ان کے قانونی وارث تھے ۔۔ رپورٹ میں واضح الفاظ میں لکھا تھا ۔۔ کہ حور بیگم کی موت ہیرا پیس کر کھانے سے ہوئی ۔۔ اور یہ کہ ۔۔ مرنے والی کے رحم میں تین ماہ کا حمل تھا۔

یوسف میاں نے وہ کاغذ اپنی اندرونی جیب میں رکھ لیا ۔۔

جب مہتاب دلھن کو قبر میں اتارا جانے لگا تو یوسف میاں بے اختیار ان کی طرف لپکے ۔۔ اسی لمحہ ایک بزرگ نے انھیں ٹوک دیا۔

" میاں ۔۔ اب تم مرحومہ کے لیے نامحرم ہو چکے ہو" ۔ یوسف میاں ٹھٹھک گئے ۔۔

وہ تو ساری عمر مہتاب دلھن کے لیے نامحرم ہی رہے تھے ۔۔ محرم ہوتے ۔۔ تو کم از کم انھیں یوں جان نہ دینا پڑتی ۔۔ اور یوسف میاں قبر پر مٹی ڈالے بغیر ہی، وہاں سے چلے گئے۔
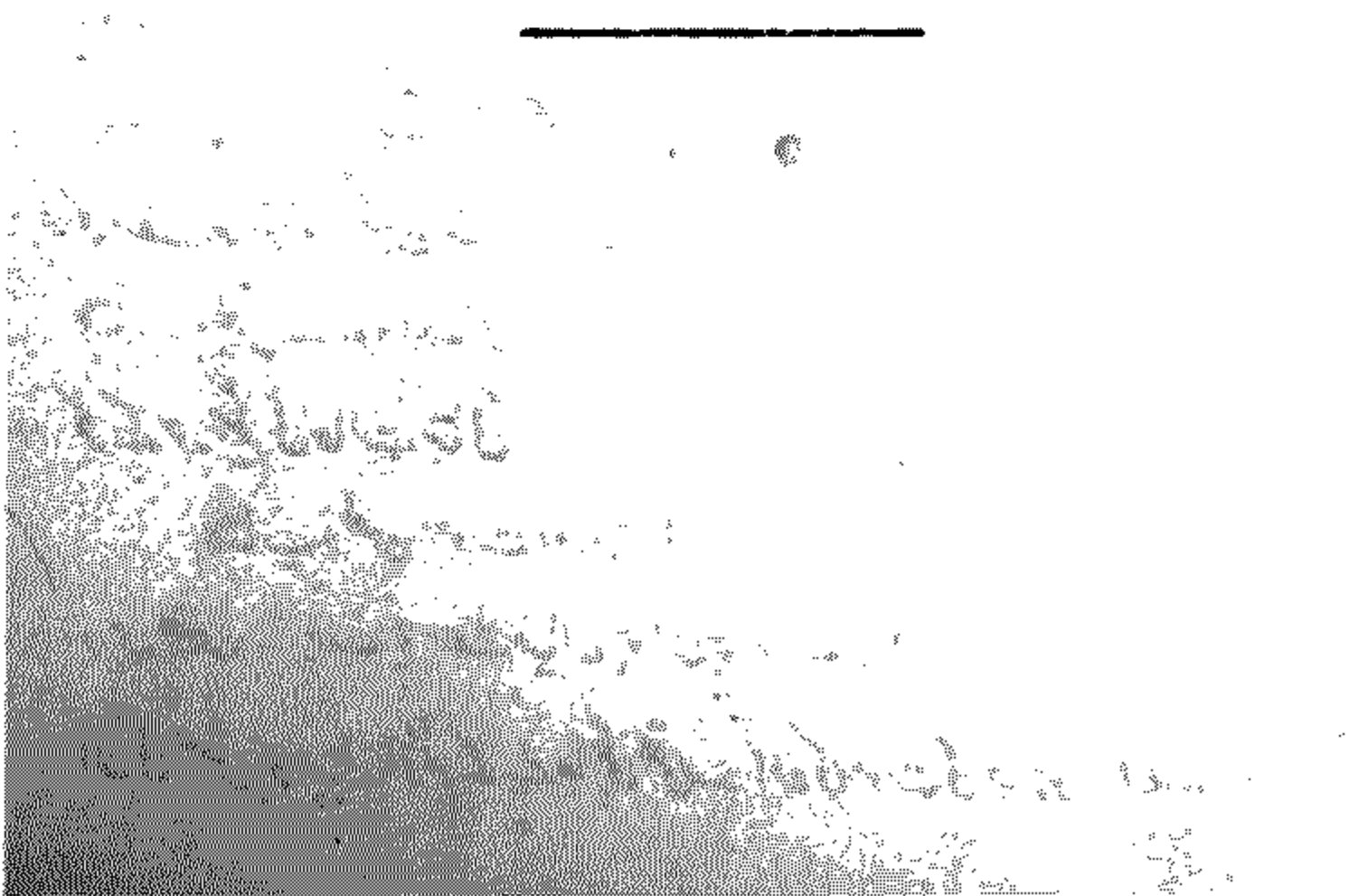
چارہ گری

اسپتال کے ننگی فرش پر انیتا کی جلی ہوئی نعش رکھی ہے۔ جس کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ جھلسا ہوا، سوختہ اور مسخ شدہ جسم، کل تک ایک خوبصورت لڑکی کا جسم تھا۔ یہ بدہیبت، ڈراؤنا اور بے جان پیکر قدرت کی صناعی کا ایک دل نشین نمونہ تھا۔ میرے میں سیندور گوندھ کر جو رنگ بنتا ہے ــــ وہ اس جسم کا رنگ تھا۔ بیضوی ہنس مکھ چہرہ جس پر چمکتی ہوئی ذہین آنکھیں ــــ مسکراتے ہوئے لب ــــ اور کشادہ پیشانی اس کو ہزاروں میں منفرد رکھتے تھے۔ وہ بےحد شوخ، چنچل اور حاضر جواب تھی۔ ہنسنا ہنسانا ہی اس کی فطرت تھی۔ لیکن اب ــ اب یہ اکڑا ہوا بدن، جھلسی ہوئی رنگت ــــ اور بدنما چہرہ دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ انیتا ہے۔ ماں باپ کی لاڈلی ــ چار بھائیوں کی اکلوتی اور چہیتی بہن ــــ اور کالج کی ہردلعزیز اسٹوڈنٹ ــــ ایک روز قبل وہ اسی حالت میں اسپتال میں داخل کی گئی تھی۔ چاہنے والے ساس اور سسر اپنا سینہ کوٹ رہے تھے۔ شوہر

دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ دیکھنے والے ان کے ساتھ رو رہے تھے۔ چھ سات ماہ کی بیاہی لڑکی ۔۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی پھیکا نہیں ہوا تھا۔ یوں جھٹ پٹ ختم ہو گئی۔ چوبیس گھنٹے موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار رہ کر وہ سارے قید و بند سے آزاد ہو گئی اور دنیا والوں کو موت و زندگی کا فلسفہ نہ سمجھا سکی ۔ کہ دراصل زندگی وہ ہوتی ہے۔ جو لڑکی اپنے ماں اور باپ کے گھر میں ہنسی خوشی رہ کر گذارتی ہے ۔ اور موت ۔۔ ؟ موت دراصل نام ہے شادی کے بعد والی زندگی کا ۔۔ جہاں لڑکی ہر لمحہ ۔۔ ہر پل مرتی رہتی ہے۔ اس موت کا خاتمہ کبھی ہوتا ہے۔ اور کبھی نہیں ہوتا اور لوگ زندگی کے پردے میں موت کا سودا کر بیٹھتے ہیں ۔۔ کہ وہ زندگی کے نہیں ۔۔ موت کے سوداگر ہوتے ہیں ۔۔ جو نئی زندگی دینے کا وعدہ کر کے انھیں موت کے خوفناک منھ میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ بس انیتا کے ساتھ بھی یہی ہوا ۔۔ اس کی جھلسی ہوئی نعش ۔۔ اسی طرح کے سودے کا ثبوت ہے"۔

انیتا کے پتا جی گورنمنٹ کالج میں سنسکرت کے لکچرر تھے۔ بوڑھے ماں اور باپ کے ساتھ بیوی اور پانچ بچوں کا ساتھ تھا۔ انیتا سب سے بڑی تھی۔ پھر چار بیٹے تھے۔ حق حلال کی تنخواہ کے علاوہ کوئی اور آمدنی نہیں تھی ۔۔ جو لڑکے گھر پر پڑھنے آجاتے تھے ان سے پیسے کا سوال کرنا ایک "گرو" کے معزز رتبہ کے خلاف تھا ۔۔ کہ اس کے پاس بانٹنے کے لیے ۔۔ علم کی دولت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ۔۔

بیٹی کی شادی کے خیال سے پنڈت جی نے کچھ روپیہ پیس انداز بھی کیا تھا ۔۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا ۔۔ کبھی کسی اہم ضرورت پر اس میں سے پیسے نکال کر خرچ کر ڈالتے ۔۔ تو دوسرے وقت اخراجات میں کوٹی کر کے انھیں پورا کرنے کی بھی کوشش کرتے۔ لیکن یہ رقم کبھی سود خور مہاجن کی رقم کبھی نہ بن سکی۔ جو دن رات صرف بڑھتی ہی رہتی ہے۔ انیتا نے اعز

پاس کیا تو پنڈت جی نے کئی جگہ اس کے رشتے کی بات چلائی ۔ لڑکے والوں نے انیتا کو دیکھا تو بہت پسند کیا۔ لیکن ہر بار ـــ بات نقدا ور جہیز پر آکر ٹھپ ہوگئی ۔ ان کی مانگیں پوری کرنا غریب ٹیچر کی حیثیت کے باہر تھا۔ اپنی مانگیں کم کرنا ـــ لڑکے والوں کے اصول کے خلاف تھا۔ اسی کش مکش میں دو سال اور بیت گئے ـــ انیتا نے بی ایس ۔ سی پاس کر لیا ۔ وہ اب ایک بالغ نظر ـــ سمجھدار اور سنجیدہ لڑکی تھی ـــ اسے روز روز کے سوانگ بالکل ناپسند تھے ۔ اس نے کئی بار ماں سے صاف الفاظ میں کہا ـــ

" ماں ـــ میں تعلیم یافتہ ہوں ـــ جاہل یا گنوار لڑکی نہیں ہوں ۔ جانور نہیں انسان ہوں ـــ پھر میرے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کیا جاتا ہے ـــ جیسے میں کوئی بکاؤ چیز ہوں ۔ ہر بار سجا سنوار کر مجھے پیش کیا جاتا ہے ـــ نتیجہ کیا نکلتا ہے ۔ ؟ "

" بیٹی ـــ شادی بیاہ تو سبھی لڑکیوں کا ہوتا ہے ـــ اور اسی طرح سے ہوتا ہے ـــ پرانے رسم و رواج ہم کیسے توڑ سکتے ہیں ؟ "

ماں سمجھاتی ـــ لیکن انیتا کا دل اپنی اور ماں باپ کی اس توہین پر تڑپ اٹھتا تھا ـــ بغاوت کر بیٹھتا تھا ۔ وہ سرے سے شادی کے خلاف تھی ـــ لیکن وہ ایک کمزور لڑکی تھی ۔ تنہا پورے سماج کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی ـــ اس لیے جب انل کا رشتہ آیا تو وہ مخالفت نہ کر سکی ۔ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

انل پی ڈبلو ڈی میں ٹھیکیدار تھا۔ تعلیم ہائی اسکول تک تھی ۔ لیکن اچھی آمدنی کے خیال سے تعلیم کی کمی کا زیادہ خیال نہیں کیا گیا ۔ انل اپنے ماں باپ کے ساتھ اسے دیکھنے آیا ـــ اور پسند کر گیا ۔

ان کے جانے کے بعد ماں نے کہا ۔

" لڑکا تو اچھا ہے ـــ

"ماں! ـــ لڑکے تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ بے چاری لڑکیوں ہی کی قسمت کھوٹی ہوتی ہے۔ ساتھ لگے۔ ان کے ماں باپ بھی تقدیر کو روتے ہیں"

شاید انیتا کو اس بار بھی رشتہ پکا ہونے کا یقین نہیں تھا۔ لیکن بھگوان نے اس کے نیک دل بیتا ـــ اور گنگا سمان بھولی بھالی ماں کا دل رکھ لیا۔ بیاہ پکا ہو گیا ـــ اور وہ شہنائیوں کی گونج میں بابل کی چوکھٹ سے بدا ہو کر پیا کے گھر چلی گئی۔

پاس پڑوس اور برادری کے لوگوں نے جہیز پر اعتراض کیا۔ انیتا کا جی چاہا گھونگھٹ الٹ کر نقدی کی وہ رقم بھی بتا دے جو سسر جی گوڈیاں گنوا کر اس کے پتا جی سے لائے تھے۔ اور جس کا یہ لوگ نام بھی نہیں لے رہے تھے۔ لیکن ابھی تو اس کا گھونگھٹ ہاتھ بھر لمبا تھا۔ جس کو خود ہٹانا بڑی بے شرمی کی بات تھی۔ ہر پھر کر بات اس کی تعلیم پر آجاتی تھی۔ اور اس بے حیائی کو بھی اس کی تعلیم سے جوڑ دیا جاتا ـــ اس لیے وہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہی ـــ

بیاہ کے بعد پہلی بار انیتا میکے گئی تو مرجھائی اور کھلائی ہوئی تھی۔ ماں نے اسے چھاتی سے لگا کر اداسی کا سبب پوچھا ـــ تو وہ اس شفیق سینے میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

"ماں! تم سب کے چھوٹنے کا دکھ ہے۔ اور کچھ نہیں"

جی میں کہا ـــ

"ماں۔ صرف تم سب سے چھوٹنے کا ہی دکھ نہیں ہے۔ اس کا بھی دکھ ہے کہ تم نے مجھے کیوں جنم دیا ـــ دے ہی دیا تھا تو اپنے سے الگ کیوں کیا۔؟ اپنے چرنوں میں پڑا رہنے دیتیں۔ سب کی سیوا کر کے زندگی بیت جاتی ـــ پر اب بیتنا کٹھن ہے"

ـــ سسرال گئی تو ساس نے مہری کو الگ کر دیا۔

"باپ نے جہیز میں لونڈیاں تو دی نہیں ہیں کہ بیٹھ کر پلنگ کے پائے توڑو۔

نہ ہمارے گھر حرام کی کمائی آتی ہے کہ فضول خرچی کی جائے "۔

انیتا من ہی من میں ہنس دی۔ واقعی ایک ٹھیکیدار کے مقابلہ میں ٹیچر کی کمائی سراسر حرام ہی کی ہوئی ۔۔ ٹھیکیدار تو سب کو حلال کرکے کھاتا ہے۔ نہ جانے کتنے غریبوں کا خون اس کی گردن پر ہوتا ہے۔

برتنوں کے انبار سے جوجھتے ہوئے اس نے سوچا۔

" انیتا جی ! ۔۔ بی۔ایس۔سی کی ڈگری کو راکھ میں ملا دو ۔۔ کہ اب یہی تمہارا جیون ہے ۔۔ خوشبو کے جھونکے تو پیچھے چھوٹ گئے "۔

ایک دن الماری صاف کرتے ہوئے نچلے خانہ سے ایک تصویر نکلی ۔۔ انل اور اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی ۔۔ دولہا دلھن کے لباس میں ۔۔ پشت پر لکھا تھا ۔۔

" انل ۔۔ اور ۔۔ سیتا "۔

انیتا نے تصویر جھاڑ پونچھ کر ڈریسنگ ٹیبل (DRESSING ۔۔ TABLE ۔۔) پر رکھ دی ۔۔ انل آیا تو اس کی نظر تصویر ہی پر پڑی۔ وہ جھجکا۔ اور پھر تصویر اٹھا کر انیتا کے قریب چلا آیا ۔۔ اور متانت سے بولا ۔۔

" یہ میری بیوی سیتا ہے ۔ دو سال ہوئے مر گئی "۔

" بڑا افسوس ہوا "۔۔ انیتا نے آہستہ سے کہا ۔۔

" کس بات کا ۔۔ اس کے مرنے کا ۔۔ یا اس کا کہ تم کو بتایا نہیں گیا "۔

" دونوں باتوں کا "۔۔ انیتا سنجیدہ تھی ۔

" میرے خیال میں تمہارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا "۔

" یہ آپ کے سمجھنے کی بات نہیں ہے "۔

" تم کہنا کیا چاہتی ہو آخر ۔۔ ؟ "

" یہی کہ ۔۔ دوہا جو لڑکوں کا ریٹ (RATE) کنواروں سے کم ہوتا ہے۔ میرے باپ کو آپ لوگوں نے جھوٹ بول کر دھوکہ دیا ۔۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے

— اُلٹا آپ لوگ سارے میں جہیز کی کمی کا رونا روتے ہیں —" — دوہرا جہیز پاکر بھی ہوس باقی رہی "

بیٹھے بٹھائے ایک روز ساس نے نیا شوشہ چھوڑا — "بہو! انل سارا سارا دن لُو دھوپ میں سائیکل پر مارا مارا پھرتا ہے۔ باپ سے کہو اسے اسکوٹر خرید کر دیں۔ دیکھو — پاربتی کے باپ نے بیاہ کے دو مہینے کے بعد داماد کو اسکوٹر لے کر دے دیا "

"پارجی کے پتا کاروباری آدمی ہیں — وہ چاہیں — تو داماد کو کار بھی لے کر دے سکتے ہیں — میرے پتا جی ایک تنخواہ میں کیا کیا کریں؟ "

" اب یہ تو ہم جانتے نہیں — پر دل تو ہمارا بھی ہے "

" پتا جی نے جو نقد روپیہ دیا تھا اس سے خرید لیں اسکوٹر "

" اس سے تو کاروبار کا گھاٹا بھی پورا نہیں ہوا — وہ بھی کوئی رقم تھی"؟

انیتا خاموشی سے اوپر چلی گئی — اسے سچ مچ اس وقت اپنے پتا جی پر غصہ آرہا تھا — کہ کیوں خواہ مخواہ اتنی رقم خرچ کر ڈالی اس کے بیاہ پر۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہی پیسہ اس کے بھائیوں کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کیا جاتا۔ کم از کم لڑکے بڑھاپے کا سہارا تو ہیں — داماد کیا دے گا —؟" —

انیتا میکہ سے واپس آئی تو انل نے پہلی رات کو وہی سوال دہرایا۔ اور اس کے انکار کرنے پر اپنا بستر نیچے اٹھا لیا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ماں نے بھرا ہے۔ وہ غصّے کو ضبط کر کے خاموش ہو گئی — اور پھر تو جیسے مظالم کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔ انیتا کا گورا بدن چوٹوں کے نیل سے جا بجا سوج گیا۔ کھانے کی تھالی آنگن میں بجنے لگی۔ انیتا سر جھاڑ منہ پہاڑ بنا نہائے دھوئے کام میں لگی رہتی تھی — وہ جانتی تھی کہ یہ سارا غصّہ اسکوٹر کے لیے ہے — لیکن وہ اب اپنے ماں باپ کو مزید زیر بار کرنا نہیں چاہتی تھی — وہ ان انسان نما درندوں سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی — وہ انھیں صبر و ضبط — اخلاق اور قوتِ برداشت سے رام

کرنا چاہتی تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ کم از کم انل اس کی بات سمجھ لے ۔ وہ اس کا پتی ہے ۔ اس کا جیون ساتھی ہے ۔ اگر وہ مان لے تو پھر ماں باپ کو مناتے کیا دیر لگتی ہے ۔ ؟ "

انیتا کتنے ہفتوں سے میکے نہیں گئی تھی ۔ اس دن اچانک ہی اس کا جی چاہا کہ گھر ہو آئے ۔ ساس سے اجازت مانگی تو انھوں نے منھ پھاڑ کر کہہ دیا۔

" مائی ملا ۔ میکہ نہ ہوا جی کا جنجال ہو گیا۔ اب تو میکے ہی میں جا بیٹھو "

انیتا خاموش ہو گئی ۔ اس کی ساری ذہانت، حاضر جوابی تیزی اور طراری رخصت ہو چکی تھی ۔ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی ۔ حوصلے پست ہو گئے تھے۔ وہ کچن میں گئی ۔ اسٹوو میں مٹی کا تیل بھرا ۔ دو چار ہاتھ ہوا کے بھرے دیا سلائی دکھائی ۔ اسٹوو جلنے لگا ۔ انل کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ چائے کا پانی چڑھا کر وہ کسی سوچ میں گم ہو گئی ۔

" انل کو اپنا سارا زیور دے دے گی ۔ کہ انھیں بیچ کر اسکوٹر لے لیجیے ۔ لیکن بھگوان کے لیے ایک انسانی زندگی کو بھینٹ نہ چڑھائیے "

وہ بے خیالی میں اسٹوو میں ہوا بھرنے لگی ۔

اچانک ایک شعلہ بھڑکا ۔ اور انیتا اس کی لپیٹ میں آ گئی ۔ اسٹوو پھٹ چکا تھا۔۔ چاروں طرف مٹی کا تیل پھیل گیا تھا ۔ اور شعلے بھڑک رہے تھے۔ کچن سے انیتا کی فلک شگاف چیخوں کی آواز آ رہی تھی ۔

موت کے سوداگر پھر آزاد تھے ۔
ایک نیا سودا کرنے کے لیے ۔

خاموشی کی زبان

دادی اماں نے وسیع سہ دری کے کئی چکر لگا ڈالے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی جس کو وہ اضطراب اور پریشانی میں گھمانا بھول گئی تھیں۔ وہ کسی فکر میں ڈوبی ہوئی سہ دری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہی تھیں۔ لیکن اس فکر کا حل ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس پریشانی کا کوئی علاج ممکن نہ تھا۔

کل ـــ ؟ ہاں کل صبح فجر کی نماز کے بعد انھیں استخارہ دیکھنا تھا۔ اس استخارہ پر ایک دو نہیں، تین زندگیوں کے بننے یا بگڑنے کا فیصلہ ہونا تھا۔ ان کی انگلیوں کی ایک جنبش پر ان کی قسمتوں کا فیصلہ منحصر تھا۔ یہ تینوں بیٹیاں کسی نہ کسی طرح سے ان سے وابستہ تھیں۔ ان سے سب کا گہرا تعلق تھا۔ قریبی رشتہ تھا۔ ایک رشتے کو دوسرے پر فوقیت دینا ان کے ہاتھ میں تھا۔ شبینہ ان کی نواسی تھی۔

واصف ان کا پوتا۔۔۔ اور عدیل کی پوتی عاشی ان کی بھی پوتی تھی۔ کیونکہ عدیل ان کے چچازاد بھائی تھے اور قصہ یہ تھا کہ شبینہ واصف کو پسند کرتی تھی۔ شاید چاہتی بھی ہو۔ وہ واصف سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ بہ ظاہر ان کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لیکن مشکل ضرور تھی ۔۔۔ واصف اور عاشی ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اور شادی کر کے محبت کا بندھن مضبوط کرنا ہر محبت کرنے والے کا جائز حق ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بھی شادی کے خواہشمند تھے۔ لیکن اس مرحلہ پر شبینہ کا پلڑا بھاری پڑ رہا تھا۔۔۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی تھی اور اپنے باپ کی بے انتہا دولت کی تنہا وارث بھی۔ بچپن سے اس کی ہر جا و بیجا ضد پوری کی گئی تھی۔ اس لیے وہ اپنی بات منوانے کی عادی تھی ۔۔۔ اور وہ ڈنکے کی چوٹ پر واصف سے اپنے لگاؤ کا اعلان کرتی تھی۔ اور جب بھی اس کی شادی کا ذکر نکلتا۔ وہ جھٹ واصف کا نام لے کر اپنی پسند کا برملا اظہار کر ڈالتی ۔۔۔ اس کی اس بات پر کبھی کسی نے ردکا ٹوکا بھی نہیں ۔۔۔ اور واصف پر اس کا حق بالکل اسی طرح تسلیم کیا گیا۔ جیسے بچپن میں ہر اچھی چیز پر وہ اپنا حق تسلیم کرا لیتی تھی۔ لیکن اب مشکل یہ آپڑی تھی کہ واصف کوئی بے جان کھلونا تو تھا نہیں جو اسے بخش دیا جاتا۔ وہ ایک ذہین، سنجیدہ اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔۔۔ اس کی اپنی پسند تھی، اپنے جذبات اور احساسات تھے۔ اور اس کی پسند تھی عاشی۔۔۔ اور صرف عاشی۔ اور عاشی نے واصف کو صرف پسند ہی نہیں کیا تھا۔ چاہا تھا، پوجا تھا، جس آہٹ پر اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ وہ آہٹ واصف کی ہوتی تھی۔ جس آواز پر وہ سرتاپا سماعت بن جاتی تھی ۔۔۔ وہ آواز واصف کی تھی ۔۔۔ اور جسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کا رنگ شہابی ہو جاتا تھا۔ وہ واصف تھا۔ اس کی نظریں جس کے حضور میں سجدہ ریز ہو جاتی تھیں۔ وہ واصف تھا۔ اور واصف ان دھڑکنوں کی زبان سمجھتا تھا۔۔۔ ان نظروں کی سجدہ ریزی کے

رازسے واقف تھا۔ اور عاشی کے شہابی رنگ میں خود اس کے ارمانوں اور چاہتوں کا رنگ شامل تھا۔ لیکن اس راز سے صرف تین لوگ واقف تھے۔ ایک وہ خود دوسری عاشی ـــ اور تیسری دادی اماں ـــ ہاں ـــ دادی اماں بھی اس راز سے واقف تھیں۔ حالانکہ ان سے کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا تھا ـــ لیکن وہ خاموشی کی زبان سمجھتی تھیں۔ چالیس برس کی خاموشی، صبر اور قوتِ برداشت نے انھیں خاموشی کی زبان سمجھنے کی قوت عطا کی تھی۔ ان کی اس طویل اور صبر آزما خاموشی کا سبب بھی ان کے سوا کسی کو نہیں معلوم تھا۔ وہ تو سب کچھ بھول گئی تھیں ـــ لیکن جب ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جانے لگی تو ماضی کے واقعات اپنی پوری سچائی اور تلخی کے ساتھ ان کے سامنے آگئے۔

اس وقت وہ اٹھارہ انیس سال کی تھیں ـــ اور کائنات بہت حسین تھی ـــ ہر پھول شاداب اور شگفتہ نظر آتا تھا۔ زمین تاحدِ نظر سرسبز اور آسمان نیلا اور پانی شفاف دکھائی دیتا تھا۔ چاند خود بخود باہوں میں سمٹ آتا تھا۔ اور تارے دامن میں سما جاتے تھے ـــ اور فضا میں خوشبو ہی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ غرض دنیا بہت حسین تھی۔ زندگی بہت خوبصورت شے تھی۔ اس کی وجہ عدیل تھے۔ ان کے منگیتر عدیل ـــ وہ بھی ان کے لیے اپنے دل میں نرم نرم گوشے رکھتے تھے۔ جس کا اظہار بھی وہ کھل کر کرتے تھے ـــ لیکن اچانک ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی ـــ اور صبیحہ ان کے بیچ آہنی دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ وہ بےحد خوبصورت تھی ـــ اور لومڑی کی مانند چالاک ـــ اس کی باتوں میں سحر تھا اور اداؤں میں جادو ـــ اور یہ جادو اپنا کام کر گیا۔ اور عدیل اس کی خوبصورت اداؤں کے جال میں پھنس گئے۔ وہ صبیحہ کے دیوانے ہو گئے۔ اور کالج کی حسین اور شوخ تیتری کے آگے ان کی محبت ریت کی دیوار کی مانند ڈھتی گئی اور وہ ایک معصوم اور سہمی ہوئی فاختہ کی طرح ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئیں۔ اور صبیحہ، عدیل کو لے اڑی ـــ ان کی شادی ہو گئی۔ دونوں خوش

غم زندگی گزارنے لگے ــــ ان کے پاس شادی نہ کرنے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔
مجبوراً وہ بھی دلہن بن کر شوہر کے گھر آگئیں۔
اسد نے ان کے دامن میں زندگی کی ہر خوشی ڈال دی لیکن ان کی خاموشی
کو زبان نہ مل سکی یعنی وہ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھنے کو ترس گئے۔ محبت
کے دو بول سننے کے لیے کیا کیا جتن انھوں نے نہیں کیے۔ لیکن وہ ایک بےجان
بُت کی مانند خاموش رہیں۔ تنگ آکر اسد نے اپنا رویہ بدل ڈالا۔ اور
ان پر اتنی زیادتیاں کیں کہ پتھر بھی چیخ اٹھتا لیکن وہ سب کچھ سہتی رہیں اور
اُف نہ کی۔ بالآخر۔ اسد نے دوسری شادی کر لی ــــ لیکن ان پر اسد کے
اس اقدام کا بھی کوئی ردّعمل نہیں ہوا ــــ
بچے بڑے ہو گئے تو وہ اور بھی گوشہ نشین ہو گئیں ــــ اور اب تو برسوں
سے ان کی دنیا اس سہ دری میں سمٹ آئی تھی۔ شب و روز کی عبادت اور
کم گوئی نے ان کا رتبہ اور وقار بڑھا دیا تھا۔
واصف کی شادی کا ذکر نکلا تو اس بات کا فیصلہ ہوا کہ اس کی شادی ــــ
ثمینہ کے ساتھ ہوگی۔ لیکن خلاف امید۔ واصف نے اس شادی سے
صاف انکار کر دیا۔ اس کے انکار سے جو قیامت آئی سو آئی۔ لیکن واصف نے
عاشی کا نام لیا۔ تو ثمینہ نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ سب لوگ اس کی ضدی
طبیعت سے واقف تھے۔ لیکن اس معاملہ میں اس کی ضد پوری کرنا آسان
نہیں تھا۔ واصف اس کی ضد پر قربان ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب معاملہ
کسی طرح طے نہ ہوا ــــ تو آخر کار فیصلہ اوپر والے پر چھوڑ دیا گیا اور دادی اماں
سے استخارہ کرنے کے لیے کہا گیا ــــ اور اب ــ بعد نماز فجر انھیں استخارہ
دیکھنا تھا۔
دادی اماں کی چالیس برس کی خاموش زندگی میں یکایک تلاطم
پیدا ہو گیا تھا ان کے جذبات کی پُرسکون سطح پر یادوں کے کنکر جو لہریں اور

بھنور پیدا کر رہے تھے۔ انھوں نے دادی اماں کو مضطرب کر رکھا تھا۔ اور اب عدیل و صبیحہ سے بدلہ لینے کا وقت آگیا تھا ـــ وہ عاشی کی قسمت کا فیصلہ کر کے عدیل اور صبیحہ کا کلیجہ نوچ سکتی تھیں۔ عاشی ان کی لاڈلی اور چہیتی پوتی تھی۔ جس کی ماں بچپن ہی میں مرگئی تھی ـــ اور اسے ان دونوں نے آنکھ کا تارا بنا کر رکھا تھا۔ وہ عاشی کے خلاف فیصلہ کر کے انھیں یہ بتا سکیں گی کہ زندگی جب اجڑتی ہے تو کیا محسوس ہوتا ہے۔ کلی مرجھاتی ہے تو باغ کی رونقیں کیسے اجڑ جاتی ہیں ـــ اور جب نازک نازک دل میں نیزہ کی انی چبھوئی جاتی ہے۔ تو کیا قیامت گذرتی ہے۔ اور اپنی مرضی کے خلاف ایک ناپسندیدہ شریکِ حیات کے ساتھ زندگی گزارنے کا عذاب کیسا جان لیوا ہوتا ہے ؟ ـــ

وہ اس وقت پوری طرح اس بات پر قادر تھیں کہ عاشی کی قسمت کا فیصلہ جو چاہے کر دیں۔ اور عدیل و صبیحہ کو جیتے جی موت کی سزا دے دیں۔ ظاہر ہے کہ شبینہ سے بڑھ کر تو عاشی نہیں ہو سکتی ـــــــــــــ اور نہ شبینہ سے زیادہ انھیں عاشی کی خوشی عزیز ہو سکتی ہے۔ رہا واصف ـــ تو شادی کے بعد وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ شبینہ کے باپ کی چمچاتی ہوئی کاریں۔ فلک بوس کوٹھیاں۔ دھواں اگلتی ہوئی ملیں اور بینک بیلنس واصف کو اداسی کے گرداب سے جلد ہی نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ دولت کی چکا چوند میں ایک کروڑ کی بھلائی نظر آئے گی۔ وہ عاشی کو بھولنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اور شبینہ جیسی بیوی پانے پر اپنی قسمت پر رشک کرے گا۔ رہی عاشی تو وہ بھی جی ہی لے گی۔ نہ جی سکے گی تو مرجائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے اس کے مرنے یا جینے سے۔ ؟

دادی اماں تھک گئیں تو لیٹ گئیں ـــ لیکن نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکیں تھیں اور ان کا اضطراب کم ہو گیا تھا۔ موذن نے خدا کی بزرگی کا اعلان کیا ـــ تو وہ بستر سے اٹھیں۔ سہ دری سے باہر آئیں

اور اپنی مخصوص چوکی پر بیٹھ گئیں۔ وضو کرنے کے لیے لوٹے پر ہاتھ رکھا تو لوٹے کے گرد لپٹے ہوئے سانپ نے اُن کی انگلی میں ڈس لیا۔ اور سرسراتا ہوا کسی طرف غائب ہو گیا۔ دادی اماں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ وہ بہ مشکل نماز کی چوکی تک آئیں اور تسبیح ہاتھ میں اٹھائی تھی کہ بیہوش ہو گئیں۔ ان کو ہوش آیا تو گھر کے سب افراد ان کے قریب جمع تھے۔ ڈاکٹر انجکشن لگا چکا تھا لیکن وہ اپنی لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی حالت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔ واصف ان کے پاس کھڑا تھا اور ان کے پائینتی کی طرف عاشی کھڑی تھی۔ خاموش، اداس اور سوگوار۔

دادی اماں نے اس پیاری سی موہنی صورت والی لڑکی کو دیکھا۔ آہ۔ اس کی خاموشی ان سے کچھ کہہ رہی تھی۔

" دادی اماں! اس طرح ہمیں بے سہارا چھوڑ کر نہ جائیے۔ ہمارا کیا ہوگا۔ ؟ ہم کیسے جئیں گے دادی اماں۔ ؟"

دادی اماں خاموشی کی زبان سمجھ چکی تھیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے کمزور آواز میں کہا۔

" بیٹا! میں نے استخارہ دیکھ لیا ہے۔ شبینہ کے ساتھ منع آیا ہے۔ عاشی کے ساتھ بہتر آیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ واصف کی شادی عاشی کے ساتھ ہو۔"

دادی اماں کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گئی، ان کے نیلے پڑتے ہوئے جسم کے برخلاف ان کا چہرہ بے حد تابناک اور پرسکون نظر آرہا تھا۔

واصف نے سفید چادر سے دادی اماں کا جسم ڈھانپ دیا۔

پیش بندی

سرکار نے مخمل کا نرم و گرم لحاف سر سے تھوڑا سا سرکا کر ـــ آنکھیں بند کیے کیے اوّل کلمہ پڑھا۔ پھر الحمد کا سورہ ـــ اور پھر چاروں قل پڑھے۔ اور تب اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں کے سامنے لا کر اپنی انگلیوں میں پہنی ہوئی چاندی کی انگوٹھیوں پر نظر ڈالی۔ جن میں عقیق، فیروزہ، درِ نجف اور مانک جڑے ہوئے تھے۔ اور چند قیمتی پتھروں پر آیۃ الکرسی اور چند دعاؤں کے نقش کندہ تھے ـــ اور تب انھوں نے گردن گھما کر اس سمت دیکھا۔ جدھر سے نرم نرم ریشمی سرسراہٹ کی سی آواز آ رہی تھی۔ تیرہ چودہ سال کی لڑکی ـــ ہاتھ میں سرکی کی جھاڑو لیے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے فرش پر جھاڑو دے رہی تھی۔ شاید اسے ان کے آرام کے خیال کے ساتھ ساتھ اپنا کام ختم کرنے کی بھی جلدی تھی۔ اس لیے ان کے بیدار ہونے سے قبل ہی وہ صفائی سے فارغ ہو جانا چاہتی تھی۔ پھر ان کے جاگنے اور سونے کے اوقات بھی تو بے تکے تھے۔ رات

میں دیکھ دو بجے تک سونا اور دن کے گیارہ بجے تک بیدار ہونا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ روز ہی ان کے بیدار ہونے سے پہلے جھاڑ دو دے ڈالتی ہو۔۔ آج تو وہی خلافِ معمول جلدی اٹھ گئے تھے۔

سانولی رنگت اور گداز جسم کی یہ لڑکی بھی ان کے محل کی پچاسوں باندیوں اور کنیز زادیوں میں سے ایک تھی۔ انھیں کسی باندی کا نام یا صورت یاد نہیں رہتی تھی۔ بس ان کی ایک آواز "ارے کوئی ہے۔۔؟" ۔۔۔۔ پر دو چار کنیزیں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتی تھیں۔ وہ انھیں حکم دیتے ۔۔۔ اور حکم کی بجا آوری ہو جاتی۔

انھیں، "ارے کوئی ہے"؟ ۔۔۔ کہنے کی عادت بھی بس چند ہی سال سے پڑی تھی۔ ورنہ سرکار بہو صاحب خود ہی ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد یہ مجبوری ان کنیزوں کو براہ راست احکام دینا پڑتے تھے۔ مغلانی صاحب اور خانم صاحب محل کا کل انتظام کرتی تھیں۔ سرکار کو کسی بات کی تکلیف نہیں تھی ۔۔۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ گھر لو سکھ سرکار بہو صاحب کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا محل تھا پچاسوں نوکر چاکر تھے لیکن سرکار کا دل تھا کہ گھر میں ایک پل نہیں لگتا تھا۔ انھیں تو نوشہ میاں کی بھی زیادہ فکر نہیں رہتی تھی۔ کتنی منتوں مرادوں کی اولاد تھے نوشہ میاں ۔۔۔ لیکن پیاری رفیقِ حیات کے بعد ان کی دلچسپی بیٹے میں بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ ان کو بہت کم وقت دیتے تھے۔ عموماً دن کے خاصہ پر دونوں کی ملاقات ہوتی تھی۔۔ اس وقت چند رسمی باتیں ہو جاتی تھیں کبھی دعا سلام اور مزاج پرسی تک ہی گفتگو محدود رہتی تھی۔۔ اور وہ چپ چاپ خاصہ نوش کر کے دسترخوان سے اٹھ جاتے تھے۔

نوشہ میاں اپنے ابا حضور کے لیے بہت کڑھتے تھے۔ امی حضور کی زندگی میں انھوں نے کبھی باپ کو خاموش اور افسردہ نہیں دیکھا تھا۔ ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے۔ ان کا زیادہ وقت محل میں انھیں لوگوں کے ساتھ گزرتا تھا بلکہ

کبھی کبھی تو اتی حضور لاڈ میں آکر کہہ دیتی تھیں —
"خدا کے لیے ذرا دیر کے لیے باہر بھی تو جایا کیجیے — ہر وقت گھر میں گھسے رہتے ہیں — یار دوست کیا سوچتے ہوں گے؟"
"— یہی کہ اپنی بیگم کی زلف کے اسیر ہیں نواب صاحب" — وہ جواب دیتے — اور بیگم ہنس پڑتیں —
نوشہ میاں کو وہ اپنا گل و گلزار گھر یاد آتا — تو وہ اداس ہو جاتے۔ اتی حضور کے انتقال کے بعد خود وہ بھی الجھ کر رہ گئے تھے۔ چاہتے تھے کہ باپ کا غم بانٹ لیں — لیکن ان کا ہیاؤ ان سے زیادہ نہیں کھلتا تھا — اس لیے وہ ان کی دلجوئی نہیں کر پاتے تھے — اب ان کا زیادہ وقت باہر گزرتا تھا۔ احباب جمع رہتے — شطرنج کی بازی جمتی — شعر و شاعری ہوتی — میر صاحب بے تکے قصے سُناتے — مرزا صاحب داستانِ امیر حمزہ کا کوئی قصہ پڑھتے۔ اور جب ان سب سے دل اکتا جاتا — تو وہ اپنی خواب گاہ میں چلے جاتے — باری دار پیر دباتے اور وہ سو جاتے — رات کا کھانا چھوٹ گیا تھا۔ بس عشاء کی نماز کے بعد تھوڑی سی فیرینی نوش کر لیتے تھے — اور وہ بھی اس لیے کہ سرکار بہو صاحب کی تاکید تھی کہ رات کو فاقہ کرنا بُرا ہوتا ہے۔ اور وہ فاقہ کر کے اپنی چہیتی بیگم کی یاد کو تازہ کر لیتے تھے — احباب کا کام اور فرائض بالخصوص اس وقت کچھ اور بڑھ جاتے ہیں — جب ان کے مالک پر بُرا وقت آجاتا ہے۔ اور یہ بُرا وقت اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ رنڈوے ہو جائیں — ایسے میں ان ہمدردوں کی خدمات دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہیں — سرکار کے احباب بھی اس خدمت کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔ ڈھیروں رشتے ان کو بتائے گئے تھے۔ اور ان کی سوگوار زندگی کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا تھا کہ خود سرکار کو اپنی بدنصیبی کا احساس دُگنا ہو گیا تھا — لیکن وہ دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوئے وہ مرنے والی سے بے وفائی کرنے کا تصور ہی گناہ سمجھتے تھے — پھر اب تو

نوشہ میاں بھی ماشاء اللہ جوان ہو رہے تھے۔ وہ تو اب ان کی دلہن لانے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔ بن ماں کا بچہ بگڑتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ پھر جب کہ محل کنیزوں اور کنیز زادیوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔

سرکار بڑی دلچسپی سے لڑکی کو جھاڑو لگاتے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً ان کی نظر اس کے داہنے ہاتھ پر پڑی ـــــ اور جم کر رہ گئی۔ لڑکی کی درمیانی انگلی میں کوئی چیز چمک رہی تھی ـــ ہرچند کپڑے کی دھجی لپیٹ کر اسے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی ـــ لیکن ہیرے کی چمک بھی کہیں جوہری کی نظر سے پوشیدہ رہ سکتی ہے ـــ انھوں نے ذرا سا اٹھ کر مسہری کے تکیہ سے ٹیک لگائی۔ اور دھیمی آواز میں پکارا ـــ

"اے لڑکی" ـــ؟ لڑکی ٹھٹکی ـــ

"ادھر آؤ" ـــ

سرکار نے ذرا نرم لہجہ میں حکم دیا ـــ لڑکی رکتی جھجکتی ذرا سا قریب آئی۔ وہ اس وقت اتنی سراسیمہ ہو رہی تھی کہ ہاتھ سے جھاڑو رکھنا بھی بھول گئی تھی۔ مسہری کے قریب پہنچ کر اسے اپنی بے وقوفی کا خیال آیا تو اس نے وہیں جھک کر ہاتھ سے جھاڑو رکھ دی ـــ اور سر جھکا کر ادب سے کھڑی ہو گئی۔

"اپنا ہاتھ ادھر لاؤ" ـــ

سرکار نے حکم دیا ـــ لڑکی نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا دیا ـــ سرکار نے دوسرا حکم دیا ـــ

"یہ کپڑا کھول دو" ـــ

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اور اب اس کی درمیانی انگلی میں جم جم کرتی ہوئی انگوٹھی صاف نظر آ رہی تھی۔ سرکار نے اسے انگوٹھی اتارنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی نے انگوٹھی بڑھا دی۔ نوشہ میاں کی انگوٹھی، سرکار اچھی طرح پہچان چکے تھے۔ لڑکی ان کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور وہ اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہی تھی۔

"نوشہ میاں کی خواب گاہ میں تم ہی صفائی کرتی ہو؟"

"جی سرکار" — لڑکی ہکلائی —

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"محبوبی — نہیں — محبوبن سرکار"

محبوبن سے "محبوبی" بننے کی وجہ صاف ظاہر تھی — لڑکی ابھی تازہ تازہ جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوئی تھی، اس عمر میں ہر لڑکی محبوبہ بننے کے لائق ہوتی ہے۔

"یہ انگوٹھی تم کو کہاں سے ملی تھی — ؟"

"جی — جھاڑو دیتے میں پائی تھی"

لڑکی نے صاف اور سادہ لہجہ میں جلدی سے کہا — شاید وہ سچ بول رہی تھی — ہوسکتا ہے کہ "محبوبی" اس کی ماں ہی دلار میں کہتی ہو — سرکار نے سوچا —

"کیا تمھیں پتہ ہے کہ یہ انگوٹھی بہت قیمتی ہے؟"

"نہیں —" لڑکی نے انکار میں سر ہلایا — صاف ظاہر تھا کہ اسے ابھی ہیرے اور شیشے کا فرق نہیں معلوم تھا — لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوجائے گا —

"مجھے خوشی ہے کہ تم چور نہیں ہو"

سرکار نے اسے خوفزدہ دیکھ کر اس کی تعریف کی — اور سرہانے رکھا ہوا صندوقچہ کھول کر اس میں سے چند روپے نکال کر لڑکی کو دے دیے۔

"لو یہ تمھارا انعام ہے — اور تمھارا کام ختم ہوگیا ہو تو تم جاسکتی ہو"

لڑکی نے سلام کیا — جھاڑو اٹھائی — اور اپنی جان لے کر وہاں سے بھاگی تو پھر اپنی کوٹھری میں ہی جاکر دم لیا۔

سرکار نے انگوٹھی الٹ پلٹ کر دیکھی — اور صندوقچے میں رکھ دی۔

نوشہ میاں سے بازپرس کرنے یا ان کی لاپرواہی پر لعنت ملامت کرنے کا خیال

ترک کرکے انھوں نے مغلانی صاحب کو بلا بھیجا۔ اپنی طلبی کا حکم ملا۔ تو وہ سارا کام چھوڑ چھاڑ کر آ گئیں ــــ اور ادب سے تسلیم کرکے حکم کی منتظر ہوئیں ــــ

"مغلانی صاحب ــــ بیٹھ جاؤ" ــــ

سرکار نے موڑھے کی طرف اشارہ کیا ــــ وہ تسلیم کرکے بیٹھ گئیں۔

"مغلانی صاحب ــــ میں ایک لباس تیار کرانا چاہتا ہوں۔ یعنی دلھن کے پہننے کے لائق جوڑا ہونا چاہیے"

"میں سمجھ گئی سرکار ــــ" ــــ

"کتنے دن میں تیار ہو جائے گا یہ لباس"

"بس سرکار ایک ہفتہ میں تیار ہو جائے گا"

"میں کشوری لال سے کہلوا دوں گا ــــ تم کپڑا پسند کر لینا" ــــ

"بہتر ہے سرکار" ــــ

ــــ اور ہاں ــــ وہ لڑکی ــــ کیا نام ہے اس کا ــــ؟

محبوبی ــــ نہیں محبوبن ــــ" ــــ

"جی سرکار ــــ اپنی حیدن کی لڑکی ہے وہ"

"ہاں ــــ اسے کام سے منع کر دو ــــ اور خانم صاحب سے کہو کر ذرا اسے ادب تمیز سکھائیں ــــ صاف ستھرا رہنا بتائیں ــــ صفائی کے کام پر کسی اور کو لگا دو"

"بہت اچھا سرکار ــــ" ــــ

"اب تم جا سکتی ہو ــــ" ــــ

سرکار نے بات ختم کی ــــ مغلانی نے تسلیم کی ــــ اور وہاں سے بھاگیں سیدھی خانم صاحب کے پاس پہنچیں۔

"سنا خانم صاحب ــــ؟"

"اب تم کچھ کہو مغلانی تو یقین بھی ــــ کہاں سے بھاگی چلی آ رہی ہو جو دم

پھول رہا ہے"۔

"دم پھول رہا ہے ۔۔ وارے مارے خوشی کے میرا دم نکلا جا رہا ہے
۔۔ خانم صاحب تم سنو گی تو تم بھی ۔۔"۔۔

"نوج ۔۔ میرے دشمن مریں ۔۔ تم بات تو بتاؤ"۔

"سرکار کا گھر بسنے والا ہے خانم صاحب"۔

"اے خدا ان کو ہنستا بستا نصیب کرے ۔۔ کس کی صاحبزادی سے رشتہ طے ہوا ہے"۔۔؟

"اس فکر میں اپنا خون ناحق جلاؤ گی خانم صاحب ۔۔ تم تو بس مجوبن کو ادب تمیز و سلقیہ سکھاؤ ۔۔ ورنہ نگوڑی سرکار سے بات کیسے کرے گی؟"۔

"تو کیا سرکار ۔۔ اس نگوڑی ماری سے ۔۔ شیر! مطلب ہے"۔

"ہاں بھئی ۔۔ خدا نے اس کا نصیبہ کھول دیا ہے"۔

"سرکار نے بھی تو بس حد کر دی تھی ۔۔ سرکار بہو صاحب کے بعد گویا جوگ ہی لے لیا تھا ۔۔ کہیں رئیس زادے بھی اس طرح بیگیوں کا سوگ مناتے ہیں"۔

"چلو ۔۔ اب تو سرکار کی سمجھ میں بات آگئی ۔۔ لیکن یہ مجوبن ۔۔؟ کیسے بھا گئی سرکار کو"۔

"اے الھڑ ہے ۔۔ جوان ہے ۔۔ کوئی ادا بھا گئی ہو گی مردار کی"۔

"عیدن سنے گی تو اسے شادی مرگ ہو جائے گا"۔

"اور ہونا بھی چاہیئے ۔۔ اس ہڑدنگی کی تو قسمت کھل گئی"۔

"اچھا میں ذرا اس مجوبن کو دیکھوں ۔۔"۔

خانم صاحب مجوبن کی تلاش میں چلی گئیں ۔۔ اور مغلانی صاحب نے اپنے دالان میں آ کر تلے دانیاں سنبھالیں ۔۔

نہا دھو کر، تیل پھلیل لگا کر مجوبن کا ذرا سا منہ نکل آیا۔ جیسے ہفتوں کے جوڑی بخار کے بعد اٹھی ہو۔ نئے کپڑوں کو اس نے اپنا نیا کھونٹا جیسے اس

میں جو میں گھس گئی ہوں ـــ تیز تہذیب ہے اسے بھلا کیا کام ـ؟ بس یہ اچھا ہوا کہ جھاڑو کی گھس گھس سے نجات ملی ـ اور کھیل کود کے لیے آزادی مل گئی ـ خانم صاحب کو تو اسے سکھانے پڑھانے میں دانتوں پسینہ آگیا ـ اس نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ کوئی لفظ صحیح نہیں بولے گی ـ آٹھ دس دن میں بس اتنا ہی ہوا کہ اس کا دھبڑ دھبڑ دوڑنا ـــ کھیڑ کھیڑ کھانا ـ اور پھسر پھسر رونا چھوٹ گیا ـ اور بہ مشکل چند لفظ بولنا آئے ـ باقی کے لیے خانم صاحب نے سوچ لیا کہ سرکار خود ہی سکھا دیں گے ـ اس منھ زور لڑکی سے زیادہ مغز پچی وہ نہیں کر سکتی تھیں ـ ـ ـ

جمعہ کے دن سرکار نے مغلانی صاحب کو بلا کر کہا ـ" بعد مغرب مولوی آجائیں گے ـ آپ محبوبن کو دلہن بنا کر تیار کر دیجیے گا ـ"

" بہت اچھا سرکار "ـــ

مغلانی بی خوش خوش چلی گئیں ـ پورے محل میں سوائے ان کے ـ خانم صاحب اور عیدن کے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے ـ عیدن تو ہفتہ بھر سے اینٹھی اینٹھی پھر رہی تھی ـــ اس کی بیٹی سرکار کی منظور نظر جو بن گئی تھی اور بیگم بن کر محل پر راج کرنے والی تھی ـــ محبوبن کو نہلا دھلا کر دھنوں والا سرخ جوڑا پہنایا گیا ـ تو وہ بھنا گئی " ہم یہ سب نہیں پہنیں گے ـ ہمارا بدن چھلا جا رہا ہے "ـ

" اری مردار ـــ تیرا نکاح سرکار سے ہو رہا ہے ـــ بدنصیب راج کرے گی راج ـــ "ـــ

عیدن نے بیٹی کے کان میں سرگوشی کی ـــ اور محبوبن یہ سن کر پچھاڑ کھا گئی ـ " ہائے اللہ ـ اتنے بڈھے سے سرکار کے ساتھ میں بیاہ نہیں کروں گی اماں "ـ

چپ رہ جنم جلی ـــ ساری زندگی محل میں جھاڑو لگاتی پھرتی عیدن نے گھڑکا ـــ تو وہ چپ ہو گئی ـ

بعد مغرب مولوی صاحب آگئے ــــ نکاح پڑھا گیا۔ محبوبن بنت دُلارے ــــ آپ کا عقد رزّاق علی ولد اسحاق علی کے ساتھ۔

مغلانی اور خانم صاحب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ عیدن کو جیسے سانپ سونگھ گیا ــــ محبوبن رونا دھونا بھول کر بڑے غور سے اپنے دولھا کا نام سننے لگی ــــ

" جوں کر مُردار "ــــ

عیدن نے اس کی پیٹھ پر ایک دھوکا لگایا ــــ اور شاید مارے تکلیف کے محبوبن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ــــ اس کے ساتھ عیدن بھی پھُسر پھُسر رونے لگی ــــ آن واحد میں سارا کھیل ختم ہوگیا ــــ راج ملا بھی اور چھن بھی گیا ــــ

سرکار نے دوسرے ہی دن نوشہ میاں کا پیغام بھتیجی کے لیے اپنی بھاوج کو دے دیا۔ تاکہ ہیرے کی قیمتی انگوٹھی کی طرح صاحبزادے کسی دن دل بھی نہ پھینک دیں ــــ اور ان کی ساری پیش بندیاں بیکار جائیں۔
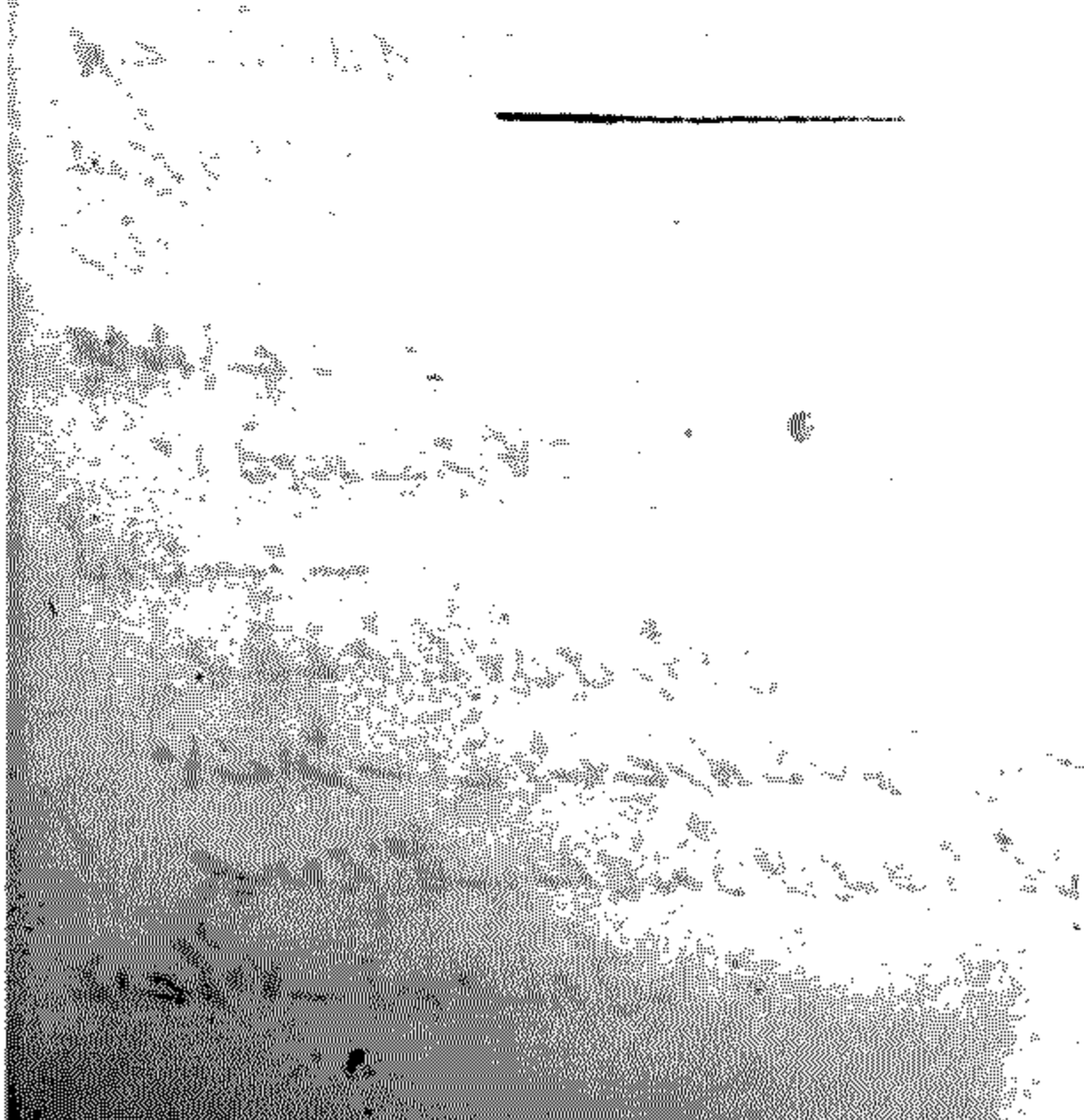
وقت وقت کی بات

بیضوی شیشے والی خوبصورت سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی مسز پاشا اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دے رہی تھیں اور 'آلا بی' ان سے ذرا فاصلے پر ہینگر لیے کھڑی تھیں۔ جس میں جوڑے رو پہلے باڈر کی سبز بنارسی ساڑی ٹنگی تھی۔ یہ ساڑی مسز پاشا نے خاص اسی موقع کے لیے خریدی تھی۔ آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی اور شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔

مسز پاشا نے ساڑی باندھی اور قدِ آدم آئینے میں خود کو گھوم پھر کر ہر زاویے سے دیکھا۔ اور ساڑی کی فال اور آنچل ٹھیک کر کے ایک بار پھر وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئیں۔ 'آلا بی' نے زیورات کا بکس ان کے سامنے رکھ دیا۔ مسز پاشا نے جڑاؤ جھالے پہنے اور پھر ایک ہار پہنا اور اسے اپنے سینے پر پھیلا کر تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ 'آلا بی' کا تصور انھیں اس ایک پل میں کہاں سے کہاں لے گیا۔ اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھیں۔

"میم صاحب! ان لمبے لمبے جھالوں کے ساتھ اگر آپ یہ جڑاؤ گلو بند پہنیے تو زیادہ اچھا لگے گا۔"

مسز پاشا کو 'آلابی' کی دخل اندازی بہت ناگوار گذری انھوں نے سخت لہجہ میں کہا۔

"آلابی! اپنی اوقات دیکھ کر بات کیا کرو — مجھ کو بھی اچھے بُرے کا سلیقہ ہے"۔

"معاف کر دیجیے"۔

آلابی کا جوش مسرت سے سرخ چہرہ آن کی آن میں زرد پڑ گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو مسز پاشا ادھر مخاطب ہو گئیں۔

"دیکھو تو ذرا کون ہے"؟ —

آلابی نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف مسٹر پاشا تھے۔ انھوں نے ریسیور مسز پاشا کو دے دیا۔

"ہیلو — بس میں تیار ہوں آپ آجائیے —"۔

مسز پاشا نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اور ذرا نرم لہجہ میں بولیں۔

"آلابی! — مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ تم اپنے سامنے بے بی کو فیڈر کرا دینا۔ یہ آیا سخت نکمی ہے"۔

"جی اچھا میم صاحب" — آلابی بکھرا ہوا سامان ٹھیک کرنے لگیں اور مسز پاشا کھٹ کھٹ کرتی باہر چلی گئیں۔

سنگھار میز ٹھیک کرتے کرتے ان کی نظر شیشے پر پڑی تو وہ چونک اٹھیں۔ وہاں ایک کمسن اور خوبصورت دوشیزہ مسکرا رہی تھی۔ وہ آہستہ سے اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ اور پلکیں جھپکا جھپکا کر اس شبیہ کو دیکھنے لگیں جس کا نام کبھی علن تھا۔ اور نواب اختر اسے عالیہ بیگم کہتے تھے۔ طوائف کے بالاخانے پر کسی طوائف زادی کو بیگم کہنا ہی بڑی مضحکہ خیز بات تھی لیکن نواب اختر نے اسے کبھی علن یا عالیہ

نہیں کہا تھا وہ اسے ہمیشہ عالیہ بیگم کہتے تھے۔ اور ایک دن وہ سچ مچ ان کی بیگم بن گئی ۔

نواب اختر نے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اس سے عقد کر لیا۔ اور وہ شہر چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ ایک شاندار کوٹھی میں رہنے لگے۔ انھوں نے کاروبار بھی شروع کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا کاروبار چمک اٹھا۔ انھوں نے زندگی کی ساری خوشیاں اپنی چہیتی بیوی کے دامن میں ڈال دیں۔ اور ایک پل کے لیے بھی اسے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ اسے کسی بالاخانے سے لائے ہیں اور عالیہ بھی سب کچھ بھول کر نواب اختر کی محبت میں ڈوب گئی کہ ایسا چاہنے والا تو کسی کسی کو قسمت ہی سے ملتا ہے ۔

"بیگم ارے بھئی عالیہ بیگم ! ۔ "

نواب اختر پکارتے ہوئے اندر آئے۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنے لمبے سیاہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

"دیکھیے، میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں " نواب اختر نے ایک منقش بکس اس کے سامنے رکھ دیا ۔ عالیہ نے بکس کھولا ۔ مانک کے جڑاؤ کا بہت خوبصورت سیٹ جگمگا رہا تھا۔

"یہ آپ کیوں لے آئے۔ پہلے ہی اتنے زیورات موجود ہیں ۔ پھر یہ فضول خرچی کیوں کی ۔ ؟ "

"اچھا ۔ ہماری محبت بھی اب فضول چیز ہو گئی "۔

"خدا نہ کرے ۔ عالیہ نے جلدی سے کہا تو وہ ہنس پڑے۔ اور جڑاؤ گلوبند اس کی صراحی دار گردن میں پہنا کر اسے پر شوق نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ بڑی طرح شرما گئی ۔

"اچھا اب جلدی سے تیار ہو جائیے۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں " نواب اختر نے اسے یاد دلایا۔ عالیہ نے لمبے لمبے جھالے پہنے کنگن اور انگوٹھی

پہنی - اور نیلی بنارسی ساڑی پہن کر تیار ہو گئی ۔

" بیگم ! شادی کی سال گرہ مبارک ہو "

نواب اختر نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر محبت سے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور اس نے بڑی عقیدت سے اپنا سر ان کے ہاتھوں پر ٹیک دیا - یہ مضبوط ہاتھ تو اس لائق تھے کہ انھیں سجدہ کیا جا سکتا تھا -

جلد ہی نواب اختر کا حلقۂ احباب وسیع ہو گیا اور ان کی شامیں کلب میں دوستوں کے ساتھ گزرنے لگیں وہ ضد کر کے عالیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے - عالیہ کو کلب کا نمائشی ماحول سخت ناپسند تھا - لیکن وہ شوہر کی خاطر چلی جاتی تھی - شریف زادیوں کی بے حیائیاں دیکھ کر اسے بالاخانہ کی زندگی یاد آجاتی تھی - جہاں کا رکھ رکھاؤ اور وضع داری کم از کم ان کلبوں سے بدرجہا بہتر تھی - اس کے باوجود بالاخانے بدنام تھے اور عیاشی کے یہ اڈے نیک نام تھے -

نواب اختر نے سوسائٹی کے آداب سیکھے تو شراب بھی پینے لگے اور جوا بھی کھیلنے لگے - جس کو وہ 'فلاسش' اور 'ہیلو' کا نام دیتے تھے - اور ہر رات لمبی لمبی رقمیں ہار جاتے تھے - عالیہ انھیں سمجھاتی تو ہنس کر ٹال جاتے - دولت بہت تھی اور اس کے ختم ہونے کا انھیں کوئی خوف نہیں تھا - لیکن عالیہ جانتی تھی کہ دونوں ہاتھوں سے لٹایا جائے تو ایک روز قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے -

عالیہ نے اپنی توجہ دونوں بچوں پر مرکوز کر دی - اس نے کلب جانا چھوڑ دیا - رضی اور نیلوفر بڑے پیارے بچے تھے اور عالیہ دونوں کو بہت چاہتی تھی - البتہ ..... نواب اختر کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کو پیار کرسکتے اب تو وہ کاروبار سے بھی لاپرواہ ہو چکے تھے - عالیہ نے انھیں کئی بار سمجھایا - اپنی محبت کا واسطہ دیا - بچوں کے مستقبل کا واسطہ دیا - لیکن شراب اور گناہ نے ان کی عقل خبط کر دی تھی -

گلنار ترقی یافتہ سوسائٹی کی فیشن ایبل طوائف تھی۔ عالیہ کو ان کے میل جول کا علم ہوا تو وہ شوہر سے الجھ پڑی ۔۔۔

"آپ گلنار سے نہ ملا کیجئے ۔۔۔ وہ بہت بدنام لڑکی ہے"۔

"کیوں ۔۔۔؟ آخر اس میں کیا خرابی ہے۔؟ ۔ اچھی فرینڈ ہے ..... بہترین ڈانسر ہے۔ اور پیلو تو غضب کا کھیلتی ہے ۔۔۔"

" لیکن ۔۔۔ وہ اچھے کردار کی عورت نہیں ہے۔ اختر! وہ تم کو تباہ کر دے گی ۔۔۔"۔

"تمھیں اس کے کردار پر حرف گیری کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ نواب اختر نے پہلی بار اس سے سخت لہجہ میں بات کی تھی ۔۔۔

" ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو بربادی کے گڑھے میں گرتے نہیں دیکھ سکتی ۔۔۔ میں آپ کی بیوی ہوں ۔۔۔ اور مجھے اس بات کا حق ہے کہ میں آپ کو غلط راہ پر چلنے سے منع کروں۔ ورنہ ۔۔۔ تجھ میں اور گلنار میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ وہ آوارہ اور بدقماش عورت میرا گھر اجاڑنا چاہتی ہے ۔۔۔ یہ نہیں ہوگا ۔۔۔ کبھی نہیں ہوگا ۔۔"۔

عالیہ نے ہذیانی لہجہ میں کہا تو نواب اختر آپے سے باہر ہو گئے ۔۔۔

"تڑاخ"۔۔۔ ان کا بھرپور ہاتھ اس کے نرم گلابی گال پر اپنے پانچوں نشان چھوڑ گیا ۔۔۔ یہ وہی مضبوط اور حوصلہ مند ہاتھ تھا جس نے کبھی اس کو سہارا دیا تھا ۔۔۔ جس کو وہ سجدے کے لائق سمجھتی تھی ۔۔۔

"تم بہت زیادہ سرچڑھ گئی ہو ۔۔۔ شاید تم بھول گئی ہو کہ میں نے تم کو عالیہ بیگم بنایا تھا ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ اسی کوٹھے پر ناچ ناچ کر مر گئی ہوتیں ۔۔۔"

نواب اختر غصے سے پیر پٹختے باہر چلے گئے ـــــ عالیہ کو ان کی بات سن کر سکتہ سا ہو گیا۔ یہ اس کی شرافت اور پاکیزگی پر کڑی ضرب تھی۔ عالیہ بن کر اس نے کون سا گناہ کیا تھا؟ جس کی پاداش میں اس کو سزا دی جا رہی ہے۔ کیا اسی لیے کوئی طلق بالا خانے سے نیچے اترنے کا حوصلہ نہیں کرتی؟ ــــ اور اپنے کوٹھے پر بیٹھ کر نواب اختر جیسے لوگوں کو بربادی کے غار میں دھکیل کر فاتحانہ قہقہے لگاتی ہے۔ کاش! اس نے بھی یہی کیا ہوتا ــــ اور محبت کے نام پر شرافت کی زندگی کے خواب نہ دیکھے ہوتے ــــ آخر ایک دن نواب اختر کو یاد آ ہی گیا کہ وہ اسے کہاں سے لائے ہیں ـــ وہ خود تو اس بات کو بھول چکی تھی ـــ لیکن نواب اختر نہیں بھولے تھے ـــــ اسے وہ دن یاد آئے جب وہ اس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کرتے تھے۔ یہی نہیں اسے اپنانے کے لیے انھوں نے اس کی نام نہاد ماں کو دولت سے نہال کر دیا تھا۔ اور آج؟ جب وہ ان کی ہو چکی ہے۔ وہ اس سے غیروں کا سا سلوک کر رہے ہیں۔ اسے یاد دلاتے ہیں کہ اسے طلق سے عالیہ بیگم انھوں نے بنایا تھا ــ ورنہ وہ اسی کوٹھے پر ناچ ناچ کر مر گئی ہوتی ـــــ

"کاش! اس نے انھیں نچا نچا کر برباد کر دیا ہوتا ــ کاش"!

عالیہ دونوں بچوں کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ بچے نہ ہوتے تو شاید وہ پھر انھیں راستوں پر لوٹ جاتی ـــــ لیکن وہ ان کی وجہ سے مجبور تھی ـــــ

نواب اختر کا برتاؤ دن بہ دن خراب ہوتا گیا۔ گلنار نے شریف زادی ہو کر بھی طوائفوں کے وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کر ڈالے جو کسی مرد کو قابو میں کر سکتے تھے۔ اور ایک دن انھوں نے گلنار سے کورٹ میرج کر لی۔ اور اسے کوٹھی

میں لے آئے۔ عالیہ نے وہاں بے عزت اور بے عزت بن کر رہنا گوارا نہ کیا۔ اور بچوں کو لے کر چلی گئی ــــ یہ بچے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھیں ہر ایرے غیرے کی چوکھٹ پر پھینکنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ اور انھیں دادا ــــ دادی کے حوالے کر دیا ــــ

وہ تنہا گمنام راستوں پر بڑھ گئی ــــ عالیہ بیگم سے علن بننے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ 'آلا بی' بن گئی ــــ ایک گھریلو ملازمہ ــــ اور آج مسز پاشا کو لمبے لمبے جھالوں کے ساتھ ہار پہنتے دیکھ کر اسے وہ جڑاؤ گلوبند یاد آگیا ــــ جو نواب اختر نے اسے شادی کی پہلی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔ نواب اختر یاد آئے تو ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے اُلٹتے چلے گئے۔

یہ وقت وقت کی بات تھی جو کل کی عالیہ بیگم آج 'آلا بی' بن گئی تھیں۔ ورنہ مسز پاشا انھیں ان کی اوقات کیوں یاد دلاتیں ــــ

مسز پاشا کو کیا معلوم کہ ایک دن اسی طرح وہ بھی شادی کی سالگرہ کے لیے سنورتی تھیں ــــ

آلا بی نے آئینے پر نظر ڈالی۔ وہاں عالیہ بیگم نہیں ــــ صرف 'آلا بی' تھیں ــــ اور وہ بے بی کو فیڈر کرانے اس کے کمرہ کی طرف بڑھ گئیں...

اب آئینہ ہر عکس سے خالی ہو چکا تھا.....

کفّارہ

رحمان چچا کو دادی امّاں نے بچپن ہی میں 'رحیو' بنا دیا تھا۔ لہٰذا گھر کے سب لوگ ان کو رحیو ہی کہتے تھے۔ ایک بس ابّا ہی ان کو رحمان بھائی کہتے تھے۔ اور یہ بات دادی اماں کو سخت ناپسند تھی کہ کوئی رحمان چچا کو اتنی بھی عزّت دے کہ ان کو ان کے صحیح نام سے مخاطب کرے۔ دادی امّاں ان سے جانوروں کی طرح گھر اور باہر کا سارا کام لیتی تھیں۔ لیکن ان کے لہجہ کا تحکّم اور ان کی سختی کبھی شفقت اور نرمی میں نہیں بدلتی تھی۔ اور شاید ان کی ایک نگاہِ کرم اور ذرا سی نظرِ شفقت کی تمنا میں ہی رحمان چچا صبح سے شام تک کام میں جٹے رہتے تھے۔ لیکن خدا جانے ان سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا تھا کہ دادی امّاں ہر وقت شمشیرِ بے نیام بنی رہتی تھیں۔ اور رحمان چچا اتنے بزدل تھے کہ وہ ان کی جھڑکیاں، گھڑکیاں اور لعنت ملامت سہتے رہتے تھے۔ لیکن کبھی ان کے رویے کے خلاف ایک لفظ شکایت کا ان کے لبوں پر نہیں آیا تھا۔ یہی نہیں

کر سکتے تھے تو کم از کم وہ اس گھر سے بھاگ تو سکتے تھے۔ لیکن ان کے دماغ میں شاید کبھی یہ ترکیب آئی ہی نہیں اور وہ ایک بے جان مشین کی طرح صبح سے شام تک چلتے رہتے۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ۔

رحمان چچا گھر میں سب افراد کو چاہتے تھے اور سب کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن میرے ابّا، اماں اور مجھ کو ضرورت سے زیادہ ہی چاہتے تھے۔ ابّا ان کا خیال کرتے تھے۔ اس لیے امّی بھی ان سے ادب و تمیز سے پیش آتی تھیں۔ اور میں تو رحمان چچا کا دیوانہ تھا۔ میں ان کو اتنا کام کرتے دیکھتا تو ضد کرنے لگتا۔

"بس رحمان چچا ـــ کام دھام چھوڑیئے۔ میرے ساتھ شکار پر چلیے"۔

"بیٹا۔۔۔ تم چلو۔۔۔۔۔ میں ذرا سا کام نپٹا لوں ابھی آتا ہوں" میں پچھواڑے والے تالاب پر بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہتا۔ اور انھیں کاموں سے فرصت ہی نہ ملتی، میں واپس آتا تو ان سے خوب لڑتا۔ لیکن رحمان چچا مجھے لپٹا لیتے۔ اور میرا سارا غصہ فرو ہو جاتا۔

دادی اماں ہمارے گھر کی اتنی جابر حکمراں تھیں کہ ان کی مرضی کے خلاف گھر کا کوئی فرد کوئی کام نہیں کر سکتا تھا اور جب دادی اماں کو رحمان چچا سے خدا واسطے کا بیر تھا تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان سے ہمدردی اور محبت سے پیش آتا۔ ابّا کی بھی ساری ہمدردیاں چھپے چوری کی تھیں۔ اور ان کی یہ ہمدردی اس لیے بھی چھپ جاتی تھی کہ رحمان چچا گھر کے باہر بنی ہوئی ملازموں کی کوٹھری میں رہتے تھے۔ اسی لیے دادی اماں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ان کے پاس کیا ہے۔ کیا نہیں ہے "۔

دادی اماں تو سدا ہی ان کو ابّا کی اترن میں پہناتی رہی تھیں۔ حد ہے کہ عید بقرعید بھی ان کو نیا لباس میسّر نہ آتا۔ اگر ابّا ان کے لیے کپڑے نہ بنواتے ـــ رحمان چچا باہر ہی نہا دھو کر نیا لباس پہنتے ـــ اور مجھے ساتھ لے کر نماز پڑھنے چلے جاتے۔ واپس آتے تو وہ کپڑے پھر بکس میں سینت دیے جاتے۔ اور جب وہ اندر آتے ـــ تو وہی پھٹے پرانے اور میلے کپڑے پہنے ہوتے۔ ان کو اس حال میں دیکھ کر دادی اماں

نہ جانے اپنے کن جذبات کی تسکین کا سامان کرتی تھیں ۔۔ اور جب میں نے ایک یہی دن سوال اماں سے کر ڈالا تو انھوں نے تنبیہی لہجہ میں کہا!

"خبردار جو کبھی ایسی بوڑھوں کی سی باتیں کیں ۔ اماں جان سنیں گی تو اچھی طرح تمھاری خبر لیں گی ۔ اور بجا بھی بُرا حشر کریں گی ۔۔"

اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ کیا رحمان چچا کی ذات اس حد تک قابلِ نفرت ہے ۔ اور اگر ہے ۔۔ تو کیوں ۔۔ کیوں"؟

ایک بار مجھے سخت بخار آ گیا ۔ رحمان چچا ایسے گھبرائے گھبرائے اندر باہر پھر رہے تھے .... جیسے انھیں کو کچھ ہو گیا ہو ۔ کبھی ڈاکٹر کے پاس بھاگے جا رہے ہیں ۔ کبھی دوا پلا رہے ہیں ۔ اور کبھی پیروں میں بھاتوں کر رہے ہیں ۔ مجھے ان کی اس محبت پر رونا آ گیا ۔۔

" رحمان چچا ۔۔ اب آپ جا کر آرام کیجیے ۔۔"

میں نے پیر کھینچ لیے ۔۔

" مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ میرے پیر چھوئیں ۔۔"

" ارے بیٹا! یہ تیرے منّے منّے پیر تو میں اپنی چھاتی سے لگائے لگائے سوتا تھا ۔۔ اور تو بھی جب تک میری چھاتی پر اپنے پیر نہیں لادتا تھا سوتا نہیں تھا ۔ اب ذرا سا بڑا ہو گیا ہے تو ۔۔ لا ۔۔ ادھر پیر دے ۔۔ "۔۔

" اچھا تو پھر ایسا کیجیے رحمان چچا کہ میرے پاس ہی لیٹ رہیے ۔ اور خدا کرے آپ کو بھی بخار آ جائے ۔ میرا ہی لگ جائے ۔ تب تو کم از کم آپ کو آرام ملے گا ۔"

رحمان چچا ہنسنے لگے ۔۔

" شریر ۔۔ تم کو کیا معلوم کہ مجھے انھیں کاموں میں آرام ملتا ہے ۔۔ کام نہ ہو تو جینا بیکار ہے "۔۔

— دادی اماں ازراہ شفقت مجھے دیکھنے آئیں — تو رحمان چچا جلدی سے میرے بستر سے نیچے اتر کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے — جیسے وہ میری خدمت نہ کر رہے ہوں — کوئی جرم کر رہے ہوں اور دادی اماں نے انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

دادی اماں چلی گئیں تو میں نے پھر انھیں ٹوکا —

"رحمان چچا — آخر آپ دادی اماں سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں ؟"

"کیا بتاؤں بیٹا! — جب میں چھوٹا سا تھا — تو میری اماں 'بی بی (وہ دادی اماں کو بی بی کہتے تھے) کو دیکھتے ہی مجھے چھپا دیتی تھیں — اور پھر میں خود ہی بی بی کی آواز سنتے ہی کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتا تھا۔ شاید وہی ڈر اب تک دل میں بیٹھا ہوا ہے "۔

"آپ کی اماں آپ کو لے کر یہاں سے چلی کیوں نہ گئیں ؟"

"کہاں جاتیں ؟ — یہیں ان کے باپ دادا پیدا ہوئے — اور یہیں اسی گھر میں مر کھپ گئے۔ یہی میرا گھر ہے۔ اور میں بھی یہیں مروں گا۔ اماں کی وصیت تھی کہ کبھی بی بی کو چھوڑ کر نہ جانا — " —

"اف — تو رحمان چچا — اپنی اماں کی وصیت پر عمل کر رہے ہیں — کیسی بیوقوف تھیں ان کی اماں — بھی — کہ جس بچے کو بی بی سے چھپا کر پالا پوسا۔ اسے بی بی کی خدمت کے لیے وصیت کے الفاظ میں باندھ کر جیتے جی زندہ درگور کر گئیں۔ اور میں نے طے کر لیا کہ کبھی میری اماں نے ایسی بے وقوفی کی وصیت کی تو میں ہرگز عمل نہیں کروں گا "۔

میری پہلی تنخواہ ملی تو میں نے سارے پیسے ابا اور اماں کے قدموں میں رکھ دیے۔ رحمان چچا بھی ہمارے قریب ہی کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیسے میں ابا کی نہیں ان کی اولاد

ہوں — اور وہ پیسے میں نے انھیں کے قدموں میں رکھے ہوں — ہاں - وہ ہمیں اس حد تک اپنا سمجھتے تھے ۔

ابا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ۔ اور ان روپیوں میں سے پچاس روپیہ رحمان چچا کو دیتے ہوئے بولے —

" رحمان بھائی — یہ تمھارے بھتیجے کی پہلی تنخواہ ہے ۔ تم بھی اس کے حقدار ہو ۔ یہ پیسے اپنا حق سمجھ کر رکھ لو ، مجھے بہت خوشی ہوگی رحمان بھائی ۔"

رحمان چچا نے خوشی خوشی روپے لیے ۔ اور پھر مجھے لپٹا کر پیار کیا ۔ اور روپے میری جیب میں رکھ دیے ۔

" بھیا — آپ نے پیسے دیے ، مجھے مل گئے — اب میرا منّا اس قابل ہو گیا ہے ۔ اور میں اپنے بڑھاپے کی فکر سے آزاد ہو گیا ہوں ۔ پہلے سوچا تھا کہ ہاتھ پاؤں گریں گے — تو کون میرا بار اٹھائے گا ؟ "

" اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ۔"

" آپ ایسا سوچتے تھے رحمان چچا — جائیے میں آپ سے نہیں بولتا ۔"

میں نے خفا ہونے کی اداکاری کی تو رحمان چچا ہنس پڑے — پھر ابو سے کہنے لگے ۔

" بھیا — میں اس قابل نہیں ہوں کہ پیسے کوڑی سے کسی کی خدمت کر سکوں ۔ ورنہ خدا جانتا ہے کہ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ آپ سب کے لیے کچھ کروں لیکن — یہی دو ہاتھ پیر میرے پاس ہیں ۔ وہ آپ کے لیے حاضر ہیں ۔"

" — اے رحیمو ہوش کی دوا کرو — خدا نہ کرے کہ میرے بچے تھک لے

ٹکڑے توڑیں - ان کے دشمن ــــ لو اب پیر کی جوتی سر کو آنے لگی - جا - جا کر اپنا کام کر - اماں، باوا سب کی زندگی گذر گئی اس ڈیوڑھی کی جھوٹن چاٹتے - اور یہ چلے ہیں ہمارے بچوں کی برابری کرنے ــ "

دادی اماں اچانک آ گئی تھیں ــ رحمان چچا سر جھکائے وہاں سے چلے گئے ــ میں نے شاکی نظروں سے ابا کو دیکھا - انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا - ـــ لیکن میں ان سے ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگا - رحمان چچا کی کوٹھری خالی تھی - بہت تلاش کیا تو وہ بڑے اطمینان سے جانوروں کو چارہ دینے میں مصروف نظر آئے - میرے خیال میں دادی اماں نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ ان کو غصہ کرنا چاہیئے تھا - اور کچھ نہیں کر سکتے تھے - تو کوٹھری میں منھ چھپا کر رو تو سکتے تھے - لیکن وہ کیسے مزے میں جانوروں کو چارہ کھلا رہے ہیں - جی چاہا تھوڑا سا چارہ ان کے منھ میں بھی رکھ دوں ــ جانور کہیں کے - ورنہ انسان ایسے بھی ہو سکتے ہیں ــ "بے عزت" میں نے دل ہی دل میں کچکچا کر انھیں بڑی سی گالی دی - اور پیر پٹختا ان کے سر پر پہنچ گیا ــ اور چارہ کی ڈلیا ان کے ہاتھ سے لے کر دور پھینک دی ــ وہ گھبرا گئے -

"کیا ہوا منا ؟" ــ

" مجھے کچھ نہیں ہوا رحمان چچا ــ آپ کو کیا ہو گیا ہے ؟ - میں آپ سے پوچھ رہا ہوں ــ دادی اماں کیوں ایسی باتیں آپ کو کہتی ہیں ــ ؟ آپ کیوں سنتے ہیں ــ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا یہاں سے اپنا ٹرانسفر کہیں اور کرا لوں گا ــ آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا ــ ورنہ ــ ورنہ آپ سے کُٹّی ــ

" اچھا اچھا ــ رحمان چچا نے مجھے لپٹا لیا ــ اور لگے مجھے منانے -

جیسے دادی اماں نے ان کی نہیں میری بے عزتی کی ہو۔ میرا دل دکھایا ہو۔۔۔

دادی اماں بہت سخت بیمار پڑ گئیں۔ رحمان چچا تو ایسے بلبلائے بلبلائے پھر رہے تھے۔۔ جیسے ان کی بڑی چاہنے والی ہستی ہوں دادی اماں۔ حالانکہ مارے ڈر کے وہ ان کے کمرے کے اندر بھی نہیں جاتے تھے۔ مبادا دادی اماں انھیں دیکھ کر ناراض ہوں اور انھیں بیماری میں اور تکان پہنچے۔ خاندان کے سب افراد دادی اماں کے قریب رہتے تھے اور ان کی خدمت کرتے تھے۔۔ لیکن دسمبر کے کڑکڑاتے جاڑوں میں دم بہ دم ڈاکٹر کے پاس بھاگنا۔۔ دوائیں لانا۔ گھڑی گھڑی انگیٹھی جلانا۔۔ پانی گرم کرنا یہ سارے کام رحمان چچا ہی کرتے تھے۔۔ اور دادی اماں کے دروازہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ جی نہ مانتا تو اندر چپکے سے جھانک لیتے۔ پھر اپنی جگہ سمٹ جاتے۔

دادی اماں کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو رحمان چچا برداشت نہ کر سکے اور ڈر، خوف بھول کر اندر چلے گئے۔ وہ ان کے پلنگ کے پائینتی بیٹھ کر آہستہ سے ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر اپنی پر سر ٹیک کر رونے لگے۔

دادی اماں نے آنکھیں کھول دیں۔۔ میں سمجھا کہ اب آئی رحمان چچا کی شامت۔۔۔

"کون ہے؟"۔۔۔ دادی اماں نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"رحمان بھائی ہیں اماں۔۔" ابا نے دھیرے سے کہا۔

"رحیو!۔۔ یہاں آ۔۔ میرے پاس۔"

دادی اماں کی آواز پر رحمان چچا ان کے نزدیک سرک گئے۔ اور گھگھیاتے ہوئے بولے۔

"بی بی! مجھے معاف کر دیجئے بی بی۔۔۔ معاف کر دیجئے بی بی" رحمان چچا بلک بلک کر رونے لگے۔ دادی اماں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ان کے سر پہ رکھ دیا۔۔

"بیٹا ــــ تیری خطا ہی کیا ہے جو معاف کردوں؟ ــــ میں ہی ساری زندگی تیرے ساتھ زیادتی کرتی رہی۔ تو مجھے معاف کردے رحمان ــــ"ــــ

"بی بی ــــ میری بی بی"ــــ

رحمان چچا ان پر سر پٹکنے لگے۔ ابّا نے جلدی سے انھیں سنبھال لیا۔

"رحمان بیٹا ــ میرے بعد ان سب کا اسی طرح خیال رکھنا اب تم ہی سب سے بڑے ہو"ــــ

رحمان چچا نے ان کا کمزور ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا ــ یہ گویا خاموش اقرار تھا۔ سب کی خدمتوں کا ــــ

دادی اماں، ابا سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں ــ "جعفر! تم تو سب کچھ جانتے ہو ــ قانوناً رحمان کا ہماری جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی تمھاری طرح برابر کا حق دار ہے ــ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اسے بھی تمھارے برابر ہی حصہ ملے۔ آگے تم جو مناسب سمجھو"ــــ

دادی اماں نے آنکھیں بند کرلیں ــ اور ابا نے رحمان چچا کو گلے سے لگا لیا ــ اور وہ بھیّا کہہ کر ان سے لپٹ گئے ــ

ہاں! رحمان چچا ابا کے سگے بھائی تھے ــ لیکن دادا ابا کی ناجائز اولاد۔ اور اسی لیے ساری زندگی دادی اماں کے عتاب کا شکار رہے۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری لمحات میں دادی اماں نے اپنی تمام غلطیوں اور زیادتیوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا ــــ رحمان چچا کو بیٹا کہہ کر، بیٹا مان کر ــــ اور ان کا حق تسلیم کرکے ــــ رحمان چچا اب بھی رو رہے تھے ــ شاید دادی اماں کا یہ کرم ان سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔

وارث

دس برس کا سن اور بائیس سو کا وثیقہ! ایک ایک کر کے اماں ابا اللہ کو پیارے ہوئے تو شاندار بیگم کو دور قریب کا ہر عزیز اپنے پاس رکھنے کو تیار ہو گیا — اور سارے چچاؤں، ماموؤں، خالوؤں اور پھپھیوں کی ممتا پھڑ پھڑانے لگی۔ اور سب لوگ بڑھ چڑھ کر اس ننھی سی جان پر اپنا حق جتانے لگے۔ کیا ہوا جو ابھی ایک دھیلا نہیں ملے گا؟ — اٹھارہ سال کی ہو گی تو سارا جمع جتھا یکمشت ملے گا — اور پھر ہر مہینے کھٹا کھٹ بائیس سو کی رقم آئے گی — جس کے پاس رہے گی اس کے تو دلدر دور ہو جائیں گے — لیکن مرحوم باپ کی وصیت نے سب کی تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔

وصیت کے مطابق انھوں نے اپنے چچا زاد بھائی سکندر نواب کو شاندار بیگم کا ولی مقرر کیا تھا — اور سنِ بلوغت تک انھیں کو اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اور اس کے شادی بیاہ کا بھی ان کو مجاز قرار دیا تھا — اور یوں شاندار بیگم

بڑے چچا کے پاس رہنے لگی۔

بڑے چچا خاندان کے دوسرے افراد کی بہ نسبت نہایت نیک، شریف اور صوم وصلوٰۃ کے پابند بزرگ تھے ان سے کسی خودغرضی اور لالچ کا بھی اندیشہ نہیں تھا۔ دو بیٹے تھے ۔ وہ بھی شادی شدہ اور بال بچے دار اس لیے والدِ مرحوم نے تو اپنی دانست میں شاندار بیگم کی دیکھ بھال کے لیے نہایت ہی موزوں ہستی کا انتخاب کیا تھا۔

شاندار بیگم کو بڑے چچا کے ہاں کوئی تکلیف نہیں تھی، جاڑے گرمی کے چار چار جوڑے بن جاتے تھے۔ کسی شادی بیاہ اور تیج تیوہار کے موقع پر بھی اچھے لباس بنوائے جاتے تھے۔ گھر پر تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ کسی کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں ملتا تھا۔۔ بھائیوں کے ننھے منے بچوں میں شاندار کا جی بھی خوب لگا رہتا تھا۔ بالخصوص شہاب کو وہ بہت چاہتی تھی۔ شاید اسی لیے بڑی بھابی اس کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتی تھیں، کبھی کبھی کھیلتے کودتے وہ مردانخانے میں جا نکلتی تو بڑے چچا صاحبوں کی موجودگی میں اس پر ایسی ممتا نچھاور کرتے کہ ان کے حسنِ سلوک کی واہ واہ ہو جاتی ۔

شاندار بالغ ہوئی تو اس کا وثیقہ کھل گیا ۔ بڑے چچا نے اپنے وکیل کے ذریعہ مختارنامہ اپنے نام لکھوا لیا ۔ ان دنوں بیگمات اور صاحبزادیوں کے باہر نکلنے کا رواج نہیں تھا ۔ بڑے چچا ہر مہینے بائیس سو کی رقم لے کر خوش خوش گھر لوٹتے۔ جس میں ان کے وثیقے کے بھی ڈیڑھ سو روپے شامل ہوتے تھے ۔ چند مہینوں کے بعد اتنے برسوں کا جمع شدہ پیسہ بھی مل گیا۔ جسے بڑے چچا نے اپنی تجوری میں محفوظ کر لیا آخر شاندار کی شادی بھی تو انہیں کو کرنا تھی ۔ وہ تو برسوں سے رشتے چھان پھٹک رہے تھے۔ اور سارے لڑکوں کے عیب لنگڑوں کی طرح چُن چُن کر سب کے

سامنے رکھ دیتے تھے ۔ اتنی خطیر رقم کی مالک لڑکی کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو تو بیاہ کر جانے سے رہی ۔

شاندار بیگم کا ذیقعہ کھلتے ہی رشتوں کی باڑھ سی آگئی ۔ ہر خاندان اسے بہو بنانے کے لیے تیار تھا ۔ اس کی معمولی صورت شکل پر بھی کسی کو اعتراض نہیں تھا ۔ دراصل ساری کشش تو اس موٹی رقم میں تھی جس کے اوپر پریوں کا حسن اور حوروں کی خوبصورتی بھی صدقے تھی ۔۔۔ بڑے بڑے صاحب دل اور صاحب نظر اسے شریک زندگی بنانے کے لیے بے چین تھے کہ کب یہ سونے کی چڑیا ان کی دیوار پر آکر بیٹھے اور وہ اسے پنجرے میں مقید کریں ۔ اور اپنے اگلے پچھلے سارے ارمان پورے کرلیں ۔۔۔ کئی صاحبزادوں نے تو اپنی محبوباؤں کو سنہرے خواب بھی دکھانا شروع کر دیے تھے کہ ادھر چڑیا ان کے جال میں پھنسی ۔۔۔ اور سارا مال و متاع محبوبہ کے قدموں پر ڈھیر کیا ۔ لیکن خدا بھلا کرے بڑے چچا کا ۔۔ کہ وہ ان لالچی، کمینے اور خود غرض لڑکوں سے اور ان کے بھک منگے اماں باوا سے خوب اچھی طرح واقف تھے ۔ لہٰذا دیکھ پرکھ کر انھوں نے سارے رشتے واپس کر دیے ۔ ان کی نیت پر شک کرنا کفر تھا ۔ ان کا اپنا کوئی لڑکا کنوارا نہیں تھا ۔ جو یہ سمجھا جاتا کہ وہ گھر کی دولت پرائی چوکھٹ پر پھینکنے کے حق میں نہیں ہیں ۔ بائیس سو کی میزان پر کوئی لڑکا پورا نہ اترنا تھا ۔۔۔ نہ اترا ۔۔۔

دیکھتے ہی دیکھتے بڑے چچا کے گھر کی حالت بدل گئی ۔ پوتیوں کے زیور بن گئے، پوتوں کا نام اسکول میں لکھ گیا ۔۔۔ ان کے اسکول جانے کے لیے ٹم ٹم بھی خریدلی گئی ۔۔۔ ساتھ لگے شاندار بیگم کے بھی چند ہلکے پھلکے زیورات بن گئے ۔ اس کی ماں کا زیور ہی کیا کم تھا ۔۔۔ لیکن وہ بڑے چچا کی تجوری میں محفوظ تھا ۔ اور بڑے چچا ان زیورات کو باہر نکال کر کوئی جوکھم مول لینا نہیں چاہتے تھے ۔۔۔

شاندار بیگم بھائیوں کے بچوں کو کھلاتے کھلاتے بیزار ہو گئیں۔ سہیلیوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچانے کے بجائے اب ان کا دل تنہائی میں لگتا تھا۔ اور ان کی آنکھوں میں حسین خواب مچلنے لگے تھے ___ وہ گھنٹوں چپ چاپ اپنی صحنچی میں لیٹی رہتیں۔ کبھی کچھ سوچ کر مسکرانے لگتیں ___ اور کبھی آپ ہی آپ شرما جاتیں۔ اور چور نظروں سے چاروں طرف دیکھتیں ___ انھیں لگتا کہ دو شوخ و بیباک آنکھیں انھیں گھور رہی ہیں ___ اور کبھی ___ ایک بھاری سا مضبوط بازو ان کے شانے کے گرد لپٹ جاتا ___ اور وہ بدحواس ہو جاتیں ___ جلدی سے اٹھ کر ٹھنڈا پانی پیتیں ___ منھ پر دو چار چھپاکے مارتیں۔ تب جا کر کہیں حواس درست ہوتے۔ لیکن وہ پھر اس خواب کے عالم میں پہنچ جانے کے لیے بیقرار ہو جاتیں ___ اس کیفیت کا جو انوکھا سا لطف تھا۔ اس میں بڑی کشش تھی ___ بڑی لذت تھی۔ سہیلیاں سمجھتیں کہ ان کا جی خراب ہے۔ وہ ان سے عذر بھی یہی کرتی تھیں۔ اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتی تھیں۔ اور نہ یہ لوگ اس قابل ہی تھے کہ ان سے شاندار اپنے دل کی بات کہہ سکتیں۔

ایک گرم دوپہر تھی ___ شاندار بیگم خس کے پردے ڈالے اپنی ٹھنڈی اور اندھیری صحنچی میں بیٹھی تھیں ___ پلنگ پر سفید چادر کسی تھی۔ سرہانے بیلے کی کلیاں رکھی تھیں ___ ان کا ہلکا پھلکا لباس خس کے عطر میں بسا ہوا تھا۔ کئی روز سے بغلوں میں پسینے کی ایسی بدبو آنے لگی تھی کہ جی متلانے لگا تھا۔ اور اسی لیے انھوں نے اپنا لباس خس کے عطر میں بسا لیا تھا ___ پچھلے کئی دنوں سے ان کی ہتھیلیوں میں ننھے ننھے سرخ سرخ دانے نکل آئے تھے۔ جن میں بڑی جلن ہوتی تھی ___ انھوں نے مغلانی بی کو ہتھیلیاں دکھائیں تو انھوں نے کہا ___

"بی بی ___ آپ ہاتھوں میں مہندی لگائیے۔ ایک تو آپ کے خون میں

ماشاء اللہ عدت ہے — اوپر سے یہ موئی گرمی — روزانہ تخم بالنگا یا تخم ریحاں کا شربت نوش فرمائیے ۔ اے بی بی — ایک بار ہمارے خالو کے خون میں حدت ہو گئی تھی تو انھوں نے حکیم سے پوچھ کر خوب کتیرہ پیا — لیکن آپ نہ نوش کریجئے گا کہیں ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کئی برس تک — • — اور آپ تو ابھی اللہ رکھے کنواری بالی ہیں — شادی بیاہ ہونا ہے —"۔

شاندار بیگم نے مغلانی بی کی باقی باتوں پر تو کان نہیں دھرا — البتہ سہ پہر کو تخم بالنگے کا شربت پیا اور رات میں ہاتھوں میں مہندی لگائی ۔ سچ مچ بڑی ٹھنڈک محسوس ہوئی — اور بہت راحت ملی ۔ سرخ سرخ ہتھیلیاں دیکھ کر شرم تو بہت آئی ۔ لیکن ہاتھ اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ سب سے چھپ کر بار بار وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہیں ۔ بالکل نئی دلہنوں جیسے ہاتھ بس اگر کسر تھی تو سرخ کامدار چوڑیوں کی اور کنگنوں کی — اور پور پور پر دیے ہوئے سنہری پھولوں والے ملی بند کی — جیسے شبو باجی نے اپنی شادی میں پہن رکھے تھے —

جیسے جیسے سورج چڑھا — گرمی بڑھتی گئی — کئی بار شاندار بیگم نے صندل کے پانی سے غسل کیا لیکن قرار نہ آیا ۔ جب تک چھوکری پنکھے کی ڈوری کھینچتی رہی ذرا سکون رہا — اور وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑی رہیں ۔ چھوکری کو اس ٹھنڈی میٹھی میں ایسا سکون ملا کہ وہ وہیں — ڈوری پکڑے پکڑے دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھ گئی ۔ شاندار بیگم گرمی سے بے حال ہو کر کروٹیں بدلنے لگیں — ان کا پھولدار مہین جمپر جسم سے چپک گیا تھا — اور دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی — ان کی کنپٹیاں تپنے لگیں — دماغ سن ہو گیا ۔ جیسے آتش فشاں میں لاوا کھولتا ہے ۔ اور پھر ابلنے لگتا ہے ۔ بالکل وہی

کیفیت اس وقت شاندار بیگم کی تھی۔ اندر ہی اندر ابال سے اٹھ رہے تھے .....
یکایک وہ ایک چیخ مار کر اٹھ بیٹھیں۔ اور وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں، ان کی چیخ پر چھوکری ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ــــ
شاندار بیگم کو جو اس حال میں دیکھا تو وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ بھری دوپہر میں
کوئی بھی صحن اور دالان میں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ روتی چلاتی صحن خانے میں گھس
گئی اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں سب کو شاندار بیگم کی کیفیت بتائی تو سب لوگ
ننگے پیر دوڑے ــــ

بڑے چچا اس وقت تہہ خانے میں آرام فرما رہے تھے ــــ بڑی بھابی نے
شاندار کو باہوں میں لے لیا ــــ شاندار بیگم رو رہی تھیں۔ مچل رہی تھیں۔
پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ اور بڑی بھابی کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھیں ــــ
"کیا ہوا شاذو! ــــ دیکھو یہ ہم ہیں ــــ بڑی بھابی کچھ بتاؤ تو ــــ ڈر گئی تھیں
کیا ــــ ؟ کوئی خواب دیکھا تھا؟"

شاندار اپنے ہوش و حواس میں کب تھیں جو جواب دیتیں۔ ان کے
ہاتھ پیر برف کی مانند ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اور وہ آنکھیں بند کیے بے حال
اپنے ہاتھ پاؤں پٹخ رہی تھیں ــــ رو رہی تھیں ــــ چلا رہی تھیں۔

چھوٹی بھابی نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے، کسی نے پنکھا جھلا۔
کسی نے لخلخہ سنگھایا ــــ پانی چمچے سے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی تو سارا پانی باچھوں
سے بہہ گیا ــــ اور دو گھنٹہ رونے تڑپنے کے بعد شاندار بیگم بے ہوش ہو گئیں۔
تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد انھیں ہوش آیا تو وہ سخت وحشت زدہ اور کچھ ڈر رہی لگ
رہی تھیں۔ بڑی بھابی ان کا سر گود میں لیے بیٹھی رہیں۔ اور ان کی دلجوئی کرتی

رہیں۔ لیکن وہ دور خلاؤں میں تکتی رہیں ــــ

بڑے چچا شام کے قریب اندر تشریف لائے تو شاندار بیگم کی طبیعت کا حال معلوم ہوا۔ وہ فوراً ان کے پاس گئے۔ ماتھا چھوا ــ سر سہلایا ــ اور بڑی شفقت سے پوچھا۔

"جی کیسا ہے بیٹی ــ ؟"ــ

" ٹھیک ہوں بڑے چچا "ــ شاندار نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

"کیا محسوس ہو رہا ہے ؟ "ــ

" کچھ نہیں ــ کچھ بھی تو نہیں ــ بس ــ بس "

" خدا نخواستہ کسی چیز سے ڈر گئی تھیں ــــ کوئی بھیانک خواب ــ یا کوئی پرچھائیں ــ ؟ "ــ

" جی نہیں ــ بس ایسے ہی طبیعت الجھ گئی تھی "ــ شاندار بیگم خود اپنی کیفیت کی وضاحت نہ کر سکیں ــــ اور وہ انھیں باہر صحن میں لٹانے کا حکم دے کر نماز پڑھنے چلے گئے ــ " بہر حال تشویش کی کوئی بات نہیں ہے " انھوں نے سوچا ــــ دماغ پر آبخرے چڑھ گئے ہوں گے ــــ یا پھر ریاح صعود اٹھا ہوگا "ــــ

بڑے چچا نے حکیم صاحب سے حال کہلوایا تو شربت، معجون اور مقوی دل دواؤں کے ڈھیر لگ گئے ــــ پرہیز الگ لمبا چوڑا بتایا گیا۔ شاندار بیگم کو تو دوائیں دیکھ کر ہَول آرہی تھی ــــ اوپر سے یہ پرہیز ــ انھوں نے دوائیں طاق پر رکھ دیں ــ اور مڑ کر ادھر نہ دیکھا ــ

مقلانی بی کی الگ ہی تشخیص تھی ــ

"ضرور بی بی پر کسی "چیز" کا سایہ ہو گیا ہے ۔۔۔ انھیں صحنچی میں تنہا نہ لیٹنا چاہیئے ۔۔۔ کورا پنڈا ہے ۔ اکیلے میں ہوتی ایسی چیزیں ستاتی ہیں "۔۔۔

اس دن کے بعد وہ سب کے ساتھ خس خانے ہی میں لیٹنے لگی ۔۔۔ لیکن پانچ چھ روز کے بعد ایک رات پھر شاندار کی طبیعت خراب ہو گئی ۔ اس دن تو ان کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ چڑ چڑا کر اپنے بال نوچ ڈالے ۔۔۔ اور لپک کر اپنے بازو اور چھوٹی بھابی کی کلائی میں کاٹ لیا ۔۔۔ اور روتے روتے بے ہوش ہو گئیں تو کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا ۔ بڑے چچا نے حکیم صاحب کو بلا کر اس حالت میں شاندار کی نبض دکھائی تھی ۔۔۔

"صاحبزادی کو ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے ہیں "۔۔۔

"ہسٹیریا ؟ "۔۔۔

بڑے چچا نے بوکھلا کر پوچھا ۔۔۔

"جی ہاں ۔۔۔ اور اس کا واحد علاج یہی ہے کہ آپ صاحبزادی کی شادی کر دیں "۔۔۔

حکیم صاحب نے علاج بھی تجویز کر دیا ۔۔۔ بڑے چچا نے ملاؤں اور سیانوں سے رجوع کیا ۔ کسی نے کہا جن کا سایہ ہے ۔ کسی نے کہا کوئی بڑی بلا ہے اور پتہ نہیں کیوں بڑے چچا ۔۔۔ جو کبھی توہم پرست نہیں تھے ان کی باتوں پر ایمان لے آئے ۔ اور جھاڑ پھونک ، گنڈے تعویذ کرنے لگے ۔ دعا تعویذ سے شاندار بیگم کے دوروں میں کوئی کمی نہیں آئی ۔۔۔ بلکہ زیادتی ہوتی گئی ۔۔۔ دوسرے تیسرے قیامت کا دورہ پڑتا ۔۔۔ کبھی کبھی تو دن میں کئی بار طبیعت خراب ہو جاتی ۔۔۔ چند ہی مہینوں میں شاندار سوکھ کر کانٹا ہو گئیں ۔ صورت پہچانی نہیں جاتی تھی ۔۔۔ ان کے طلبگاروں نے بھی ساری باتیں سن کر کانوں پر ہاتھ رکھے ۔۔۔ بائیس سو کے لیے اپنے گھر کو بھوت خانہ کون بناتا ۔۔۔ اور پیام سلام کون کہے ۔۔۔ لوگوں نے شاندار کا نام لینا ہی چھوڑ دیا ۔

بڑے چچا کا انتقال ہوا تو شاندار بیگم ان کی نعش سے لپٹ کر سسک اٹھیں "بڑے چچا! ہمیں کس پر چھوڑ گئے ـــ ہائے اب ہم کس کے سہارے جئیں گے بڑے چچا" ـــ ؟"

بھابیوں نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ دلاسہ دیا اور دلجوئی کی۔ بڑے بھائی نے کہا۔

"بی بی! ہم کس لیے ہیں ـــ ہمارے جیتے جی تم کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی ـــ دیکھو شہاب تمھارے رونے سے کتنا پریشان ہو رہا ہے"

شاندار بیگم نے شہاب کو سینے سے لگا لیا ـــ اور پھر انھوں نے اپنے شب و روز ننھے شہاب کے لیے وقف کر دیے۔ وہ اس کے چھوٹے بڑے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں ـــ اسے بیٹا بیٹا کہتے ان کا منہ سوکھتا تھا۔ شہاب بھی اپنی شانو پھوپھو سے بہت مانوس تھا۔ اور اپنی ماں سے زیادہ ان کو چاہتا تھا۔ ہر فرمائش انھیں سے کرتا تھا۔ اور شاندار بیگم جو اپنے وثیقے کا سارا پیسہ بڑی بھابی کے حوالے کر دیتی تھیں ۔ شہاب کے لیے کچھ رقم مزدوران سے لے لیتی تھیں ـــ بڑی بھابی بھی معترض نہیں ہوتی تھیں۔

شاندار بیگم کو کسی سے کوئی گلہ نہیں تھا ـــ اب ان کو دورے بھی بہت کم پڑتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی اس دن طبیعت خراب ہو جاتی تھی ـــ جس دن وہ غسل کر کے اپنا لباس موتیا، خس یا شمامۃ العنبر میں بسا کر پہنتی تھیں ـــ مہندی لگاتی تھیں ـــ اور پھولوں کا گجرا بالوں میں لپیٹی تھیں ۔ اور پھر ہاتھ چوڑیاں پہنتی تھیں۔ آخر جن کم بخت ـــ انھیں چیزوں کے تو عاشق تھے۔ فوراً آجاتے تھے ـــ سب کے منع کرنے سے انھوں نے خوشبو اور پھول سب کا استعمال ترک کر دیا۔

ایک سہ پہر وہ شہاب کو ڈھونڈتی ہوئی باہری کمرے میں چلی گئیں ۔ پھر کسی غیر آدمی کو بیٹھے دیکھ کر وہاں سے باہر بھاگیں۔ اپنے پیچھے انھوں نے ایک جاندار قہقہہ سُنا تو دل ہاتھوں سے تھام کر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔

ادھر کوئی شہاب سے کہہ رہا تھا ــــ

"ــــ شہاب ــــ ابھی کوئی آپ کو پکارتا ہوا آیا تھا۔ آسمانی ڈوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ موٹی موٹی آنکھیں ــــ کھلتی رنگت ــــ" ــــ

"ماسٹر صاحب ــــ وہ میری شانو پھوپھو ہیں ــــ جن کی باتیں میں آپ سے کرتا ہوں ــــ کتنی اچھی ہیں میری پھوپھو۔"

"اب بھی وہ تو ایسا سر پر پیر رکھ کر بھاگیں جیسے میں انسان نہیں ــــ بدمانس ہوں اب اچھی ہیں یا بُری ــــ میں نے تو دیکھا نہیں ٹھیک سے۔"

شاندار بیگم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر مسکرا پڑیں ــــ

"اچھا ــــ تو یہ شہاب کے ماسٹر صاحب ہیں ــــ میں بھی کہوں کیوں اتنے کان کھاتا ہے میرے ــــ مارے تعریفوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ خیر ــــ ٹھیک ہی ہیں۔"

دوسرے دن وہ پھر باہر کے کمرے کے پاس گئیں اور چق کی آڑ سے ماسٹر صاحب کو دیکھا کیں ــــ گندمی رنگت ــــ کھڑا نقشہ، گھنگھریالے بال ــــ دراز قد ــــ آج وہ انھیں کچھ زیادہ ہی اچھے لگ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے کچھ لکھ رہے تھے۔ شاید ان کی چھٹی حس نے انھیں بتا دیا کہ کوئی چق کے پار سے انھیں دیکھ رہا ہے ــــ وہ مسکرا دیے ــــ اور شہاب کو کسی کام سے باہر بھیج کر چق کے پاس آ کر دھیرے سے بولے ــــ

"تسلیم عرض ہے۔"

"تسلیم ــــ" ــــ شاندار کی آواز کانپ گئی ــــ

"یوں چھپ چھپ کر دیکھنے کی سند نہیں ہے ــــ سامنے آئیے" ــــ

انھوں نے جھٹ چق ہٹا دی ــــ شاندار بیگم بھاگ بھی نہ سکیں بس ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا ــــ وہ ہنسنے لگے ــــ پھر آہٹ پا کر چق برابر کر دی۔ اور اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔

اس کے بعد شاندار بیگم بہت خوش رہنے لگیں — اب تو وہ سنگھار کرتیں — جب بھی طبیعت خراب نہ ہوتی — چہرہ ہر وقت کھلا رہتا — لبوں پر مسکراہٹیں اور قہقہے مچلتے رہتے — ان کا جی چاہتا خوب گائیں خوب ہنسیں — زندہ رہنے کی امنگ نے پچھلی ساری باتیں بھلا دی تھیں —

ایک دن ماسٹر صاحب نے کہا :

• شانو ! — اس طرح کب تک آپ کو دور دور سے دیکھ کر دل کو تسلی دینا ہوگی — اگر آپ کی اجازت ہو تو — ابا جان کو آپ کے بھائی جان کی خدمت میں بھیجیں — ؟ —

• سچ کہہ رہے ہیں آپ ؟" مارے خوشی کے وہ اتنا ہی کہہ سکیں —"

• بالکل سچ ! بس خوف ہے تو یہی کہ آپ کے بھائی جان انکار نہ کر دیں — ہم آپ کے برابر کے نہیں ہیں ؟ "

"میرے دل سے پوچھئے کہ آپ کیا ہیں ؟ — آپ — آپ وہ ہیں — جو دنیا میں کوئی نہیں ہے "

وہ کہنے کو تو کہہ گئیں — لیکن پھر شرما کر بھاگ گئیں — ان کے کانوں میں مدھر رسیلی شہنائیاں گونجنے لگیں آنکھوں کے سامنے قوس قزح کے رنگ بکھر گئے — وہ سیدھی اپنی کوٹھی میں آئیں اور بستر پر گر پڑیں — اور سنبل کے نرم نرم تکیے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا —

یکا یک ماسٹر صاحب نے آنا بند کر دیا — وہ روزانہ باہر کے چکر لگاتیں — لیکن سوائے سناٹوں کے کچھ نہ ملتا — جب یہ سناٹے ان کی روح میں اترنے لگے تو وہ بوکھلا گئیں — اور آخر شہاب سے پوچھ ہی لیا —

" بیٹے — یہ آپ کے ماسٹر صاحب کیوں نہیں آرہے ہیں — کہیں خدا نہ کرے — وہ بی — مار — ڈر کر انھوں نے بات ادھوری چھوڑ دی —

• شانو پھوپھو — وہ تو ایک دن اپنے ابا جی کے ساتھ آئے تھے — لیکن

ابا جان نے ان کو بہت ڈانٹا ۔ اس کے بعد وہ نہیں آئے ۔

• کیوں ـــــ بھائی جان نے کیوں ڈانٹا ان کو ۔ شاندار بیگم کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ـــ

• ابا جان نے کہا آپ ذلیل ہیں ـــ اپنی اوقات نہیں دیکھتے ۔ شانو پھوپھو ـــ یہ اوقات کیا ہوتی ہے ـــ بے چارے ماسٹر صاحب نے دیکھی ہی نہیں اور ابا جان نے انہیں ڈانٹا ۔

ـــ شہاب کی پوری بات سنے بغیر وہ اندر بھاگیں ۔ اور جا کر بڑی بھابی سے لپٹ گئیں ـــ

• بڑی بھابی ـــ بڑی بھابی ـــ ہم لوگ آخر کب تک سب کی اوقات دیکھیں گے ـــ غریب ہونا جرم تو نہیں ہے بڑی بھابی ـــ پھر کیوں ـــ پھر کیوں بھائی جان ـــ بھائی جان نے ـــ

ـــ اور شاندار بیگم کی حالت غیر ہوتی گئی ۔ اسی دن کئی مہینوں کے بعد انھیں زبردست دورہ پڑا ۔ وہ گھنٹوں بے ہوش رہیں ۔ سارا گھر ان کی دیکھ بھال میں یوں لگا تھا ۔ جیسے انہیں کچھ ہوا تو سب کی جان ہی نکل جائے گی ـــ

اس دورہ کے بعد شاندار بیگم کو چپ لگ گئی ۔ ماہ و سال گزرتے رہے ۔ وقت سے پہلے ـــ ان کے سر میں روپہلے تار جگمگانے لگے ۔ شہاب اب بھی ان کا چہیتا تھا ـــ وہ اسکول سے کالج میں پہنچ گیا تھا ۔ لیکن اب بھی ان سے اپنے لاڈ پیار اسی طرح کراتا تھا ۔

شاندار بیگم کی طبیعت کئی دن سے خراب تھی ۔ بخار بھی تیز تھا ـــ اور کھانسی بھی شدید تھی ـــ رہ رہ کر سینے میں درد ہونے لگتا تھا ۔ شہاب نے گھر پر ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو وہ افسوس کرنے لگا ـــ

• ٹی بی کی دوسری اسٹیج ہے ۔ اور آپ نے اب خبر لی " ـــ انھیں

اسپتال میں بھرتی کرا دیجئے ۔۔۔

شاندار بیگم اسپتال جانے کے لیے تیار نہ ہوئیں ۔ آخر وقت میں غیروں کے درمیان رہنے کے خیال ہی سے الجھن ہونے لگی ۔ انھوں نے تو بارہا خواب میں دیکھا تھا کہ پھولوں سے سجا ان کا ڈولا اس چوکھٹ سے رخصت ہو رہا ہے ۔ لیکن وہ وقت بڑی دیر میں آیا ۔۔۔ شاندار بیگم نے داروغہ صاحب کو پردہ کے پاس بلاکر بڑی دیر تک ان سے باتیں کیں ۔ کچھ کاغذ سرسرائے ۔ اور انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے ۔ اپنے سامنے انھوں نے شہاب سے بھی دستخط کرائے ۔ شہاب روتا رہا ۔ لیکن ان کی ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلی ۔۔۔ اور دوسرے ہی دن شاندار بیگم کا وراثت نامہ مع ان کے نکاح نامہ کے وثیقہ کے دفتر میں داخل کر دیا گیا ۔

نکاح نامہ کی رُو سے شہاب ۔۔۔ شاندار بیگم کے وثیقے میں چوتھی حصے کا حق دار بن گیا تھا ۔۔۔ اور یہ حق شوہریت اس کی چہیتی پھوپھی نے مرنے سے پہلے خود اسے دیا تھا ۔

ان کے کنوارے سپنوں کا یہ آخری نذرانہ تھا اپنے بڑے چچا کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔

مٹّی کا مول

بجّا دادا اسکول کے سامنے نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ ٹین کا زنگ آلود بکس کھول کر پلاسٹک کی تھیلیاں نکالیں ان میں کمپنٹ ٹافی اور لالی پاپ وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ زمین پر بچھے ہوئے کپڑے پر مٹھائیاں سجا کر وہ انٹرول کا انتظار کرنے لگے۔

بجّا دادا کا یہ روز کا معمول تھا۔ وہ انٹرول سے کچھ دیر قبل آجاتے تھے اور اپنا سامان سجا کر انٹرول کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ گھنٹی بجتی تو ننھے ننھے بچے پھاٹک کھلتے ہی بھرا مار کر باہر آجاتے تھے۔ اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ اور پھر پیاری پیاری سریلی آوازیں دادا کے کانوں میں رس گھولنے لگتیں۔

• دادا ــــ ٹافی ــــ

• دادا ــــ لالی پاپ ــــ

" دادا ــــ میرے اچھے دادا کمنٹ دینا " ! ــ

سجاد دادا پھوڑے پھوڑے ہاتھوں میں سامان پکڑاتے جاتے ۔ اور خوشی خوشی سب کی فرمائش پوری کرتے ۔ بچوں کے ہجوم اور شور وغل میں وہ کسی سے پیسے لینا بھول جاتے تو وہ خود ہی ان کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتا ۔ کوئی بچہ ادھار مانگتا تو وہ ایسا خوش ہوتے جیسے وہ اپنا حق مانگ رہا ہو ۔ کسی کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیں دیکھتے تو خود ہی اس کے منہ سے ہاتھ میں لالی پاپ پکڑا دیتے ــ انٹرول ختم ہوتا تو بچے اچھلتے کودتے، ہنستے کھیلتے اندر بھاگ جاتے ۔ پھاٹک بند ہو جاتا اور دادا اپنا بکس بند کر کے دریں لیٹ جاتے ۔ نیم کی ٹھنڈی چھاؤں انھیں اپنے گاؤں کی یاد دلا دیتی ــــ اور وہ آنکھیں بند کیے لیٹے رہتے ۔ اور ان کا تصور انھیں گاؤں لے جاتا ــــ جہاں وہ ہرے بھرے کھیتوں، باغوں اور پگڈنڈیوں پر گھومتے یار دوستوں سے گلے ملتے اور اس فضا کی مانوس خوشبو کو اپنے اندر سمو لیتے اور چند لمحوں کے لیے یہ بھول جاتے کہ وہ اپنے گاؤں سے دور ہیں ۔

برسوں پہلے ان کے گھر کے سب لوگ پاکستان چلے گئے تھے ۔ سوکھے اور سیلاب کی مصیبتوں نے انھیں بزدل کر کے ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا ۔ لڑکوں کے خطوط برابر آرہے تھے ۔ وہ اصرار کر رہے تھے کہ وہ بھی چلے آئیں ۔ وہ گئے تو لیکن اس وعدے پر کہ چند ماہ رہ کر واپس آجائیں گے ۔ دو تین مہینے تو وہ بہت خوش رہے ۔ دونوں بیٹے اور بیٹیاں وہاں بے حد خوشحال تھے اور ان کا بہت خیال کر رہے تھے ۔ لیکن جلد ہی اس عیش و آرام اور خاطر مدارات سے جی بھر گیا وطن یاد آنے لگا ۔ گاؤں کی یاد ستانے لگی ۔ دوستوں کی الفت تڑپانے لگی ۔ کھیت باغ اور پھونس کا جھونپڑا بلانے لگا ۔ انھوں نے واپسی کی تیاری کر لی ۔ بیٹوں نے بہت منع کیا ۔ بیٹیوں نے آنسو بہائے پھر بھی وہ

نہ جانے تو بیٹوں نے صاف صاف کہہ دیا
"اب آپ پاکستانی شہری ہیں۔ ہندوستان سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔"
جا دادا نے یہ سنا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ لڑکوں کو خوب باتیں سنائیں۔ جی بھر کے برا بھلا کہا۔ اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ سب نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو وطن کا سودا سر سے اترا اب بڑے میاں آرام سے رہیں گے۔ اکیلی جان وہاں کہاں پڑے رہیں گے۔

ماں کب کی مر چکی تھی۔ ایک باپ کا دم تھا۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ ان کی خدمت کریں اور انھیں آرام پہنچائیں۔ کہ انھوں نے سب کے لیے کتنے دکھ جھیلے تھے۔ چلچلاتی دھوپ، گرم لو اور یخ بستہ شب و روز کا حساب کرنے بیٹھے تو پتہ چلا کہ باپ کی زندگی کا بیشتر حصّہ اسی میں گزر چکا ہے۔ اب ان کا فرض تھا کہ باپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں۔

پوتے نواسے ہر دم ان کے پاس گھسے رہتے۔ کوئی کھانا لا کر سامنے رکھتا۔ کوئی حقہ بھر کے دیتا۔ اور جب وہ لیٹتے تو ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کے پیر دبائے جاتے۔ اور کہانی سنانے کی فرمائش ہوتی۔ وہ بھی ان ننھے منے فرشتوں میں بہلے رہتے۔ رفتہ رفتہ سب کو اطمینان ہو گیا کہ اب وہ کبھی یہاں سے جانے کا نام نہیں لیں گے۔

ایک دن جا دادا چپکے سے گھر سے غائب ہو گئے۔ سب نے ان کو بہت تلاش کیا۔ لیکن وہ نہ ملے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ انھوں نے چپکے ہی چپکے گنڈا سنگھ سے بات کر لی تھی۔ اس کا دھندا یہی تھا۔ وہ ناجائز طریقے سے ادھر کے لوگوں کو اُدھر اور اُدھر کے لوگوں کو ادھر کرتا تھا۔ دادا نے اس

سے وعدہ کیا تھا کہ وہ وطن پہنچ کر اپنا کھیت اور گھر بیچ کر اس کا پیسہ ادا کر دیں گے ۔۔ گنڈا سنگھ جانتا تھا کہ اس کا روپیہ دودھ پی رہا ہے۔ اس کے آدمی وصول ہی کر لیں گے ۔ اس کے ساتھ دھوکہ کرنے والوں کا انجام بھی بُرا ہوتا تھا۔ اس لیے وہ بے دھڑک کام کرتا تھا۔

جب دادا گاؤں میں داخل ہوئے تو مارے خوشی کے رونے لگے۔ آموں میں بور آچکا تھا۔ فضا میں بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی ۔۔ باغوں میں کوئل اپنی سریلی آواز میں کوک رہی تھی ۔ رہٹ کی رُوں رُوں جلترنگ سا بجا رہی تھی ۔۔ کھیتوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے انھوں نے نم مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر سونگھا تو سوندھی سوندھی خوشبو سانس کے ساتھ اندر ان کی روح تک پہنچ گئی۔ اور اس مہک نے ان کی روح کو سرشار کر دیا ۔ انھوں نے مٹی کو آنکھوں سے لگایا۔ پھر بڑی عقیدت سے ایک کنارے ڈال دیا۔ اطمینان کی لمبی سانس لے کر وہ آگے بڑھ گئے۔ بستی نزدیک آگئی تھی۔ کتنا اپنا پن تھا یہاں ۔۔ پردیس میں تو زمین اور آسمان تک پرائے سے لگتے تھے۔

حسبِ وعدہ انھوں نے اپنا کھیت اور مکان بیچ کر روپیہ گنڈا سنگھ کے آدمیوں کو دے دیا ۔۔ اب نہ ان کے پاس انچ بھر زمین تھی نہ سر چھپانے کے لیے ٹھکانہ ۔۔ پھر بھی وہ بہت خوش تھے کہ اپنے وطن میں ہیں غیر جگہ نہیں ہیں کہ فکر ہو ۔ کبھی وہ مسجد میں پڑ رہتے ۔ کبھی کسی یار دوست کے بردنگے میں لیٹ رہتے ۔ جس کے وہ کام کر دیتے وہی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیتا ۔۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو ان سے بڑا آرام تھا ۔ بازار ہاٹ کرنا ہو یا بچوں کو سرکاری اسپتال دکھانا ہو۔ دادا ہر کام کے لیے تیار رہتے۔ گاؤں والے بھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے ۔ سبھی جانتے تھے کہ دادا صحیح آرام

چھوڑ کر صرف انھیں کی خاطر آئے ہیں ـــــ دن رات بے فکری اور آرام سے گزر رہے تھے کہ ـــــ ایک شام سندر سنگھ ان کو تلاش کرتا ہوا آ گیا۔ سندر ان کے پرانے یار مرحوم ہندر سنگھ کا بیٹا تھا۔ وہ تھانے میں سپاہی تھا۔ اس نے دادا کو چپکے سے بتایا کہ ان کے نام کا وارنٹ ہے۔ الزام ہے کہ وہ پاکستانی ہیں اور ناجائز طریقے سے یہاں رہ رہے ہیں۔

"بیٹا! تم تو جانتے ہو کہ میرے باپ دادا اور ان کے بھی باپ دادا یہیں پیدا ہوئے اور یہیں مر کھپ گئے۔ سارا خاندان یہیں کی مٹی میں دفن ہے۔ میں تو بس تھوڑے دنوں کے لیے پاکستان گیا تھا کہ سب کو دیکھ بھال کر چلا آؤں گا۔ وہاں لونڈوں نے نہ جانے کیا ہیر پھیر کیا ـــ کہ مجھے وہاں کا شہری کرا دیا ـــ میں تو یہ سوچ کر وہاں سے بھاگ آیا تھا کہ ایک بار اپنے وطن پہنچ جاؤں ـــ پھر دیکھتا ہوں میرا کوئی کیا بگاڑتا ہے ـ؟

دادا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سندر سنگھ بھی آبدیدہ ہو گیا انھیں دلاسا دیتے ہوئے بولا ـــ

"چاچا! تم ایسا کرو کہ راتوں رات یہاں سے نکل جاؤ۔ کل جب سالا تھانیدار یہاں آئے گا اور تمھیں غائب پائے گا تو اپنی رپورٹ دے دے گا کہ بھال بوٹ جا یہاں نہیں ہے۔"

سندر اپنی بات کہہ کر ہنسنے لگا ـــ جیسے وہ دل ہی دل میں تھانیدار کی ناکامی سے لطف اندوز ہو رہا ہو ـــ دادا بھی دھیرے سے مسکرا دیئے۔ پھر فکرمندی سے بولے ـــ

"سندر اس کے بعد کیا ہوگا ـــ؟ ـــ کیا میں اپنے گاؤں اور اپنے وطن سے نکال دیا جاؤں گا ـــ؟ کیا اسی کی خاطر میں نے اپنے بال بچوں کا اور عیش و آرام چھوڑا تھا ـــ؟ کھیت اور گھر قربان کیا تھا۔؟ اسی لیے۔ اسی لیے ـــ

"چاچا! اتنا بڑا ملک ہے پولیس سالی تم کو کہاں ڈھونڈھے گی۔؟
ایک جگہ نہ ٹکنا ــــ تھوڑے دنوں کے بعد جگہ بدل دینا ــــ"

"بیٹا! اپنے وطن میں چوروں طرح بھاگتے پھرنے سے تو اچھا تھا کہ غیر ملک میں رہ جاتا ــ یہ ذلت تو نہ اٹھانا پڑتی۔ پولیس تھانے کا خوف تو نہ ہوتا ــــ بھلے ہی وطن کے لیے رو رو کر مرجاتا ــــ"

دادا روہانسے ہوگئے ــــ دربدری کے خیال سے ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا ــــ

"سارا کیا دھرا تو تمھارے بیٹوں کا ہے ــــ سوچا ہوگا کہ اسی طرح پکڑ بلائیں ــــ"

"ہاں بھئی ــــ وہ وہاں چار پیسے کمانے لگے ہیں ۔ وطن کی روکھی سوکھی کا مزہ کیا جانیں ــــ؟

سندر ان کو سمجھا بجھا کر چلنے لگا تو بے اختیار ان سے لپٹ گیا ــــ دونوں رو رہے تھے ۔ سندر نے ان کی جیب میں پچاس روپے زبردستی ڈال دیے ــــ جگا دادا سندر کے جانے کے بعد بھی روتے رہے ۔ ان کے سامنے ایک ایک کر کے سارے منظر گزر رہے تھے ۔ وارنٹ گرفتاری ــــ جیل ــــ سزا ــــ اور پھر ــــ جلاوطنی ــــ"

دادا نے حسرت سے گاؤں پر نگاہ ڈالی ــــ اور پھر اندھیرے میں گم ہوگئے ۔ گاؤں کے آخری چھور پر پہنچ کر انھوں نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر انگوچھے کے کونے میں باندھی ــــ آنکھوں سے لگائی اور مرے مرے قدموں سے آگے بڑھ گئے ــــ ان کے پاؤں اس وقت من من بھر کے ہو رہے تھے ــــ اور نظروں کے سامنے تاریکی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی ــــ کہ دو قدم کے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی ــــ

سندر سنگھ کی ہدایت کے مطابق وہ تھوڑے دنوں کے بعد

جگہ بدل سمیٹے تھے ۔۔۔ ہر جگہ زمین اتنی ہی مہکی مہکی تھی جیسی گاؤں کی تھی۔ اور ہر جگہ آسمان ویسا ہی وسیع۔ نیلا اور مہربان تھا۔۔ بول چال اور رسم و رواج ضرور الگ تھے ۔۔ لیکن ان دیکھی مضبوط ڈور نے سب کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔۔ یہ ڈور تھی ہم وطنی کی ۔۔۔ یہ رشتہ تھا زمین کا۔ اور یہ محبت تھی مٹی کی ۔۔۔ جس کا مول چکانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی ۔۔ یہ تو کسی کسی کے مقدر میں ہوتا ہے ۔۔

جما دادا اب تھک چکے تھے ۔ ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ کب سے چل رہے تھے۔ آج یہاں کل وہاں ۔۔ ان کو یہ جگہ بھا گئی تھی۔ اسکول کے بچوں میں جی لگ گیا تھا۔۔ وہ اپنے بچوں کو بھی بھول سے گئے تھے۔ جب کبھی گاؤں کی بہت یاد ستاتی ۔۔ تو وہ اپنے انگوچھے کے کونے میں بندھی ہوئی مٹی کو آنکھوں سے لگا لیتے ۔۔ اور انھیں محسوس ہوتا کہ وہ اپنے گاؤں سے دور نہیں ہیں ۔ کتنا سکون تھا مٹی کے اس حقیر سے ڈھیلے کے لمس میں۔

حسب معمول دادا نے نیم کی چھاؤں میں چادر بچھائی ۔۔ اور ستانے کے لیے لیٹ گئے ۔۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے تھپکیاں دیں اور سرسراتی ہوئی ہواؤں نے لوریاں دے کر انھیں سلا دیا۔ ذرا دیر میں وہ خوب میٹھی گہری نیند کے مزے لینے لگے۔

" دادا ۔۔ دادا ۔۔ اٹھو "۔۔

کسی نے ان کا بازو ہلا دیا ۔۔ وہ جاگ پڑے ۔ نھو چاٹ والا ان کے پاس کھڑا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی اسکول کے سامنے چاٹ کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس سے اچھی خاصی یاری ہو گئی تھی۔ نھو کے پاس ہی تین ان کے سر پر تین سپاہی کھڑے تھے ۔۔ خاکی وردی ۔۔۔ ہاتھ میں موٹے موٹے ڈنڈے ۔۔ اور گھنی مونچھوں کے نیچے چھپی ہوئی مکاری تھی ۔۔

بڑے شیطان لگ رہے تھے وہ تینوں ۔۔

"کیا بات ہے بھیا ۔۔؟

دادا نے نھّو سے پوچھا ۔۔

"منشی جی تھانے سے آئے ہیں ۔ تم کو داروغہ صاحب نے بلایا ہے ۔"

نھّو نے اطلاع دی ۔۔

"ہاں ۔۔ ہمارے ساتھ تھانے چلو ۔۔" ۔۔

ایک سپاہی نے کرخت آواز میں بڑے رعب سے کہا ۔۔

"ہمارا قصور کیا ہے بھائی ۔۔؟ بوڑھے آدمی ہیں ۔ دو پیسے کا دھندا کرتے ہیں ۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں ۔"

دادا نے ہاتھ جوڑ کر بہت نرمی اور لجاجت سے کہا ۔

"تھانے چلو ۔۔ سب معلوم ہو جائے گا ۔"

دوسرے سپاہی نے خواہ مخواہ ڈنڈا لہرایا ۔۔

دادا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ۔۔ زنگ خوردہ بکس نھّو کے حوالے کیا کہ ایک وہی ان کا دوست تھا ۔ اور سپاہیوں کے ساتھ ہو لیے ۔ تھانے پہنچے تو داروغہ جی نے فردِ جرم بتائی ۔۔

"تم پاکستانی جاسوس ہو ۔۔" ۔۔

"میں ۔۔؟ ۔۔ میں ۔۔ ارے صاحب میں تو ہندوستانی ہوں ۔۔ بیچینڈی گاؤں کا رہنے والا ہوں ۔ میرے پرکھے سب وہیں کی "ہڑواڑ" میں دفن ہیں صاحب ۔۔ میں بھی وہیں کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا تھا صاحب ۔۔ لیکن ۔۔" ۔۔

"تمہارے بال بچے سب کہاں ہیں ۔۔؟" ۔۔

"وہ تو ۔۔ وہ تو سب پاکستان میں ہیں ۔"

جمّا دادا ہکلائے ۔ سچ بات آخر منہ سے نکل ہی گئی ۔۔

"اور تم سالے ___ یہاں جاسوسی کرنے چلے آئے ___ ہیں؟"___
تھانیدار کے منھ سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑا ___

"نہیں نہیں سرکار ___ ایسا نہ کہئے ___ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر۔ چین آرام تیاگ کر میں وطن کی محبت میں آیا تھا ___ اپنے وطن سے غداری کی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا صاحب یہ مٹی اس کی گواہ ہے ___" ___

دادا نے انگوچھا آنکھوں سے لگایا - اور زار و قطار رونے لگے - پھر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے ___

"یقین مانیے سرکار! اسی وطن کی خاطر در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں"۔
تھانیدار نے ان کی ایک نہ سنی ___ اور حوالات میں بند کرنے کا حکم دے دیا ___ اور پھر مقدمہ ___ عدالت ___ اور جیل ___ سارے منظر دادا کی نظروں کے سامنے آگئے ___

انٹرول ہوا تو بچے بھرّا مار کر باہر نکلے - اور دادا کے پاس جانے کے لیے ہنسی خوشی دوڑنے لگے - لیکن ___ نیم کے نیچے وہ جگہ سنسان پڑی تھی ___ دادا نہیں تھے - بچے مایوس ہو کر نتھو چاٹ والے کے ٹھیلے کی طرف بڑھ گئے اس کے چہرے پر کمینہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی - اسی لیے تو اس نے تھانیدار کی مٹھی گرم کی تھی -

جبکہ دادا نے اسے اپنا ہم وطن، دوست اور بھائی سمجھ کر اپنی ساری رام کہانی سنائی تھی ___ اور اب ___ وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بند تھے ....

مٹی کا مول ادا ہو چکا تھا۔

سُہاگن

شکستہ ڈیوڑھی سے جنازہ باہر لایا گیا اور لوگوں کے ہجوم میں اپنی منزل کی سمت بڑھ گیا۔

مرنے والے نے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں رونے کے لیے چھوڑی تھیں اور ایک بوسیدہ محل ― اور نو سو روپیہ ماہانہ پنشن کے، جو انھیں شاہی خاندان سے تعلق کی بنا پر ہر ماہ ملتے تھے ― اور دو بیویاں ― ایک بیوی وہ، جو ان کی بیاہتا بیگم تھیں ― اور ابھی تک کنواری تھیں ―

دوسری وہ جسے مرحوم بالاخانے سے اتار کر لائے تھے ― جوان کے نو بچّوں کی ماں تھی۔ جس نے ہر دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ اور جو اب بھی ان کو یاد کرکے تڑپ تڑپ کر بلک بلک کر رو رہی تھی کہ جانے والا اس کا سہاگ تھا۔ اس کے بچّوں کا باپ تھا۔ جس کی خاطر اس کا

متناسب گداز اور کندنی جسم گھل کر پانی ہو گیا تھا ــــ اور گیہوں کی بالیوں جیسا سنہری گندمی رنگ وقت کے تپتے صحرا میں جلتے جلتے راکھ ہو گیا تھا۔ اور بجلیاں گراتی تاب ناک آنکھیں اپنی ستاروں جیسی چمک اور بصارت کھوتی جا رہی تھیں ــــ اور لمبے سیاہ بالوں کی لہراتی بل کھاتی ناگنیں ایک کے بعد دوسرے بچے کی ولادت کے نتیجے میں آہستہ آہستہ غائب ہوتی گئیں۔ اور بالآخر سفید نرم اور ریشمی بالوں کے چند لچھے باقی رہ گئے تھے ــــ لیکن صاعقہ کو ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس نے اپنا حسن اور جوانی مٹی میں ملا کر کوئی غلطی کی ہے ــــ ہر بچے کی پیدائش کے بعد وہ اپنے کمزور جسم اور زرد رنگت کو ایسے پیار سے نہارتی ــــ جیسے اس نے ایک بچے کی تخلیق کا کارنامہ انجام دے کر قدرت کے خزانے سے اپنی مسرتوں کا کچھ زائد حصہ اچک لیا ہے ــــ

صاعقہ کو اپنے بچوں سے بے انتہا پیار تھا ــــ اور ان بچوں کی محبت کے واحد حصے دار، شہزاد میاں کو وہ اپنی روح کی گہرائیوں سے چاہتی تھی ــــ کہ اس کی زندگی میں آنے والے وہ پہلے اور آخری مرد تھے۔

شہزاد میاں کی بیاہتا بیگم ماہ رخ ابھی تک کنواری تھیں ــــ ان کے کنوارے سپنوں کو خوابوں کے شہزادے کا لمس کبھی نہ ملا۔ اور وہ اپنی زندہ لاش کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھائے رواں دواں تھیں ــــ یہ بوجھ کئی بار اتنا ناقابل برداشت ہو گیا کہ وہ اسے اتار پھینکنے کو تیار ہو گئیں۔ لیکن امید نے ہر بار سبز باغ دکھا کر انھیں حرام موت سے باز رکھا۔ انھوں نے محض اپنی نادانی میں شہزاد میاں کو ٹھکرا دیا ــــ اور صاعقہ نے اس محروم اور مایوس انسان کو اپنی باہوں میں پناہ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لیا ــــ شہزاد میاں جب تک جئے صاعقہ اور بچوں کے لیے جئے ــــ اور جب مرے ــــ تو انھیں اپنا نام دے کر، اپنا رشتہ مستحکم کر کے مرے ــــ اور ماہ رخ بیگم

ان کا نام لے کر نہ جی سکیں، نہ مر سکیں ۔ ان سے شہزادمیاں کا کبھی کوئی تعلق نہ رہا۔ سوا اس کے کہ وہ ان کی دلھن بن کر اس محل میں آئی تھیں صرف ایک رات کے لیے ۔۔ اس کے بعد ہر رشتہ ہر تعلق ختم ہو گیا ۔۔

شوہر کی جواں مردی سے خوف زدہ ہو کر سرکار دلھن نے اپنے اکلوتے بیٹے شہزادمیاں کی پرورش اس طرح جو تر ے بھونرے میں رکھ کر کی تھی کہ وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کی نسبت نہایت شرمیلے اور جھینپو ہو کر رہ گئے تھے۔ سرکار دلھن ایک پل کے لیے انھیں اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں ۔شہزادمیاں زرا شعور کی عمر کو پہنچے ۔ تو ان کی خدمت کے لیے جوان اور شوخ چھوکریوں کے بجائے سن سے اتری خادمائیں رکھی گئیں ۔۔ اگر کبھی محل کی چلبلی، دیدہ پھٹی چھوکریاں شہزادمیاں کے سامنے پڑ جاتیں ۔۔ تو سرکار دلھن ان کو ایسی قہر آلود نظروں سے گھورتیں کہ انھیں اپنی جان لے کر بھاگتے ہی بن پڑتا۔ شوہر کو تو کبھی سنبھالنے اور روکنے کا حوصلہ نہیں ہوا ۔ وہ مردانے سے آتی ہوئی گھنگھروں کی جھنکار سن کر بھی گونگی بہری بنی رہیں ۔ شوہر کی خلوتوں میں کبھی دخل اندازی نہیں کی ۔۔ بلکہ ان کی ہر بے راہ روی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں ۔ شادی شدہ زندگی نے انھیں بس ایک ہی خوشی دی تھی ۔شہزادمیاں کے روپ میں ۔۔ اور اب وہی ان کی ساری توجہ کا مرکز تھے۔ صبح و شام کے مخصوص اوقات میں مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب سے پڑھنے کے بعد شہزادمیاں کا سارا وقت اپنی امی جانی کے پہلو سے لگ کر گزرتا ۔ سرکار دلھن بھی انھیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر نہال ہوتی تھیں ۔۔

شہزادمیاں انیس ۱۹ برس کے ہوئے تو سرکار دلھن کو ان کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی ۔۔ ایک سے ایک تجربہ کار مشاطائیں اس کام پر مامور کی گئیں ۔ بڑی تگ و دو کے بعد نواب بصارت علی خاں کی صاحبزادی ماہ رخ کا انتخاب کیا گیا۔ جو صورت، سیرت، دولت اور حسب نسب ہر اعتبار سے یکتائے روزگار

تھیں۔ اور پھر سرکار دلھن بڑے ارمانوں سے بڑی دھوم دھام سے انھیں بیاہ کر محل میں لے آئیں۔

شہزادہ میاں تو اپنی شادی سے ایسے شرمائے شرمائے تھے کہ کسی کے سامنے ہی نہیں آرہے تھے۔ سرکار دلہن کو اپنے بیٹے پر بڑا ناز تھا کہ وہ دوسرے نواب زادوں کی طرح اوباش، عیاش اور بے غیرت نہیں ہے۔ وہ یہی تو چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا اپنے باپ دادا کی روایات پر چلنے کی بجائے نیک اور محبت کرنے والا شوہر ثابت ہو ۔۔۔ اور اپنی دلھن کے سوا کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھے ۔۔۔ ان کا شہزادہ سچ مچ ایسا ہی تھا۔ نیک، شریف اور سعادت مند ۔۔۔

رشتے کی بھاوج نے شہزادہ میاں کو حجلۂ عروسی میں پہنچا کر شرارت سے ان سے سرگوشی کے لہجہ میں کہا ۔۔۔

"بھیا! میں واری ۔۔۔ آج کی رات دلھن کو زیادہ پریشان نہ کرنا۔ بیچاری کئی دن کی تھکی ہوئی ہے ۔۔۔"

اور پھر مسکراتے ہوئے بھاوج نے باہر نکل کر کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ شہزادہ میاں کو تو پسینے آگئے۔ چور نظروں سے اس سمت دیکھا۔ جہاں چاندی کے پایوں والی چوڑی سی مسہری پر ایک سرخ گٹھری سی رکھی تھی۔ گھٹنوں پر سر ٹکائے۔ آنکھیں بند کیے وہ بظاہر ان سے بے خبر بیٹھی تھی ۔۔۔ لیکن اس کا رواں رواں ان کا منتظر تھا ۔۔۔

جب بڑی دیر تک کوئی آہٹ نہ ہوئی ۔۔۔ تو دلھن نے کسمسا کر پہلو بدلا۔ شہزادہ میاں کو خیال آیا کہ دلھن شاید بے آرام ہو رہی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سخت شرمندہ ہوئے۔ اور ان کے نزدیک جا کر دھیرے سے بولے ۔۔۔

"آپ آرام کیجئے .... میں اُدھر فرش پر سو رہوں گا"۔

دلھن نے ذرا حیرت سے اپنے دولھا کی بات سنی .... جو ابھی چند لمحے پہلے ہی آیا تھا۔ اور آتے ہی سو جانے کی بات کر رہا تھا۔ جس پیا کے انتظار میں دلھن کی آنکھیں ایک انجانے نشے سے بوجھل ہو رہی تھیں ۔ اور نہ جانے کتنے شوخ و شنگ ارمان ہمک ہمک کر سر اٹھا رہے تھے ۔ اس نے تو ابھی تک اپنی دلھن کا گھونگھٹ تک نہیں اٹھایا تھا۔ اس کی صورت دیکھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔ سہیلیوں نے دولھا کے گھونگھٹ اٹھانے کا کیا دلکش نقشہ کھینچا تھا۔ کیف و سرور، شرم و مستی کی کیسی حسین داستانیں سنائی تھیں۔ مانا کہ وہ بہت شریف اور شرمیلے ہیں لیکن یہ وقت بھلا اس طرح شرم اور جھجک دکھانے کا ہے؟ کیا یہ رات بار بار آئے گی ۔ یہ سہاگ رات جو ہر کنواری لڑکی کی زندگی میں بس ایک بار آتی ہے۔ جہاں سیج کی منھ بند کلیاں کھلنے سے پہلے ہی مسل کر رہ جاتی ہیں۔ اور خود ہی کسی کلی کے پھول بننے کی رازدار بن جاتی ہیں ....

ماہ رخ نے گھونگھٹ کی آڑ سے دیکھا۔ پچ مچ شہزاد میاں قالین پر لیٹے تھے۔ مخملیں کشن سرہانے رکھا تھا۔ روشنی کی وجہ سے انھوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ماہ رخ بھی لیٹ رہیں۔ لیکن ساری رات انھیں نیند نہ آئی۔ اور وہ ریشمی گلابی چادر پر کروٹیں بدلتی رہیں۔ جیسے جیسے رات ڈھلتی گئی سہری اور سیج کی مونھ بند کلیاں کھلتی گئیں اور ماہ رخ کے دل کی کلی مرجھاتی گئی ۔

ان کے ساتھ محل کی خاص خادمہ انوری آئی تھی اور ان کی موانی بیگم بھی آئی تھیں۔ صبح کو شہزاد میاں کے جانے کے بعد جب وہ دونوں اندر آئیں تو بستر کی بے داغ چادر اور اس کے بے شکن لباس نے گویا ساری داستان کہہ ڈالی۔ موانی بیگم نے سوالیہ نظروں سے ماہ رخ کو دیکھا۔ ماہ رخ نے سر جھکا لیا۔

لیکن آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں نے ان کی بے کلی کا راز فاش کر دیا۔
مومانی بیگم اور انوری نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ ہو رہیں۔

دوپہر سے قبل ماہ رخ واپس میکے چلی گئیں۔

مومانی بیگم اور انوری نے جو بات ماہ رخ کی والدہ سے کہی اسے سن کر انھیں غش آگیا۔ نواب بصارت علی نے بیٹھک میں پناہ ڈھونڈھی۔ اور ماہ رخ شوخ و شنگ سہیلیوں سے مونھ چھپا کر اپنے کمرہ میں بند ہو گئیں کہ ان کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

شام سے پہلے نواب صاحب نے اپنے خاص مصاحب لڈن مرزا کو دولھا کے گھر بھیج کر کہلا بھیجا کہ چوتھی لانے کی زحمت نہ کریں وہ اپنی لڑکی کو رخصت نہیں کریں گے۔ ساتھ میں شہزادے میاں کی کمزوری کا سرٹیفکٹ بھی بخش دیا۔ سرکار دلھن نے سمدھی کا پیغام سنا تو انھیں سکتہ سا ہو گیا۔ ان کی بیس برس کی محنت کا ایسا پھل انھیں ملے گا یہ انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ورنہ وہ اپنے بیٹے کو شریف اور نیک بنانے کی بجائے آوارہ، بدمعاش اور عیاش بننے دیتیں۔ کم سے کم اس کی جوانمردی کے ڈنکے تو پٹ گئے ہوتے۔

اب ان کے بیٹے کی کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ خود فینس میں سوار ہو کر سمدھیانے گئیں۔ بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کی قسمیں کھائیں۔ اپنی عزت اور ناموس کا واسطہ دیا۔ لیکن نواب بصارت ٹس سے مس نہ ہوئے اور کسی صورت میں ماہ رخ کو رخصت کرنے کو آمادہ نہ ہوئے۔

نواب صاحب نے فرمایا:

"ابھی تو لڑکی صرف ایک ہی رات کے لیے سسرال گئی تھی اور جیسی بے داغ گئی تھی۔ ویسی ہی واپس آئی۔ ہم اس کی کہیں اور شادی کر سکتے ہیں۔"

لیکن دوبارہ بھیجنے کے بعد تو ساری بدنامی ہمارے ہی سر آجائے گی۔ اور لڑکی کی کہیں اور شادی بھی نہیں ہو سکے گی۔"

"وہ تو ویسے بھی نہیں ہو سکے گی ۔۔۔"

سرکار دلھن نے پُر اعتماد لہجہ میں کہا......

"ہمیں شرعاً طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔"

"ہم طلاق نہیں دیں گے ۔۔۔ اور یہ بات ثابت کر دیں گے کہ ہمارا نیک اور شریف بیٹا مکمل مرد ہے ۔ اور اس وقت آپ کفِ افسوس ملیں گے ۔ یاد رکھیے کہ ایک شریف لڑکے پر اتنا بڑا بہتان رکھ کر آپ سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔ اس کے لیے آپ ساری زندگی پچھتائیں گے۔"

اس روز سرکار دلھن ناکام اور نامراد وہاں سے لوٹ آئیں ۔ اور چوتھی نسوخ کر کے صبر و شکر کے ساتھ سب کی باتیں سنتی رہیں۔ جب یہ سرگوشیاں شہزاد میاں کے کانوں تک پہنچیں تو وہ سناٹے میں آگئے ۔ لیکن بات ایسی تھی کہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے ۔ دوست کوئی تھا نہیں۔ اب وہ اپنی چوڑی چھاتی اور مضبوط باہوں، آہنی کلائیوں، سینے میں دھڑکتے ہوئے دل اور رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون کا مقصد سمجھ چکے تھے۔ لیکن بات اب باہر نکل چکی تھی ۔۔۔ اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند واپس نہیں آسکتی تھی۔

وہ ایک کمزور مرد نہیں تھے ۔ جو منہ چھپا کر روتے ۔ وہ شریف اور غیور انسان تھے۔ اس لئے ماں سے کتراتے کتراتے پھرتے رہے۔ سرکار دلھن بیٹے کا حال دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہیں۔ وہ ان ساری باتوں کا ذمے دار خود کو سمجھ رہی تھیں۔ کاش وہ مستقبل کے اندیشوں سے خوفزدہ ہو کر بیٹے کی اس انداز سے پرورش نہ کرتیں۔ خواہ ان کی طرح شہزادی دلھن کو بھی سوتوں کا جلاپا دکھ ہی کرنا پڑتا۔

کم از کم ان کا بیٹا اس طرح رسوا تو نہ ہوتا......

اس روز محل سے ملحقہ چھوٹی کوٹھی میں سرکار دلھن نے پہلی بار قدم رکھا۔ ورنہ یہاں بس محفلیں ہی سجتی تھیں.... اور محل کی بیگمات کو ادھر آنے کی ممانعت تھی۔ سرکار دلھن نے پہلی بار یہ پابندی توڑی تھی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر خاندانی روایات کو انھوں نے اس طرح بالائے طاق رکھا کہ مہندی جان سے ملاقات کی ـــــ مہندی جان ڈیرہ دار طوائف تھیں.... نوابوں اور رئیسوں میں ان کی بہت شہرت اور عزت تھی۔

سرکار دلھن نے جب مہندی جان کو اپنی بات سمجھائی تو مہندی جان فوراً اس شریف زادی کی مدد کرنے کو تیار ہو گئیں۔

"مہندی جان! نواب بصارت نے ہمارے لڑکے کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ نام نہاد شریف لوگ اب اسے اپنی لڑکی نہیں دیں گے۔ اسی لیے ہم نے ان کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے تم سے مدد طلب کی ہے ـــــ"

سرکار دلھن کی آواز میں لرزش تھی۔

"مہندی آپ کے خاندان کی نمک خوار ہے سرکار! ـــــ آپ کے کسی کام آ سکیں۔ اس سے بڑھ کر اور ہماری خوش قسمتی کیا ہوگی؟"ـــــ

"ہم تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے" ـــــ

"احسان کیسا سرکار! صاعقہ کی تو قسمت کھل جائے گی"

میری بھانجی آپ کی تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ انشاء اللہ میں اسے پورے اعتماد کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کروں گی" مہندی جان نے سرکار دلھن کو دعائیں دی ـــــ

"افسوس تو اس کا ہے مہندی جان کہ ہم نے اپنے بچے کو بُری صحبتوں سے بچانے کے لئے ہر جتن کر ڈالا ..... اور ان اونچے خاندان والے بے راہ رَو لوگوں نے ہمارے شریف بیٹے کو یہ انعام دیا۔ ہم انھیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک شریف نوجوان کو بدنام کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو نواب بصارت ساری زندگی اپنے بیٹی کو پہلو سے لگائے کڑھتے جلتے رہیں گے۔ میں اپنے بیٹے کو شاد و آباد دیکھنا چاہتی ہوں"۔

"انشاء اللہ کل مغرب سے پہلے ہی میں صاعقہ کو لے کر حاضر ہو جاؤں گی۔ آپ ذرا بھی فکر مند نہ ہوں ــــ ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا ..."

مہندی جان نے انکسار کے ساتھ عرض کیا.... اور سرکار دلھن کی دعائیں لے کر رخصت ہو گئیں ــــ

"مہندی جان کے لیے یہ واقعی فخر اور عزّت کی بات تھی کہ اس کے خاندان کی لڑکی ایک رئیس زادے کی شریکِ زندگی بنے۔ ڈھکے چھپے یا کھلے عام یہ رئیس زادے انھیں بطور داشتہ کے یوں بھی رکھتے آئے تھے۔ لیکن کسی شریف زادی نے ان کی بیٹیوں کو اپنی بہو بنانے کا شرف کبھی عطا نہیں کیا تھا ــــ مہندی جان صاعقہ کی قسمت پر ناز کر رہی تھیں۔

ایک بار پھر شہزادمیاں دولھا بنے ــــ چھوٹی کوٹھی میں ان کا عقد صاعقہ کے ساتھ پڑھا گیا ــــ اور وہ اسے رخصت کرا کے محل لے آئے۔ جلوہ سی میں داخل ہوتے وقت وہ پُر اعتماد اور پُر جوش تھے۔ وہ شرمیلا اور جھینپو شہزادہ ان سے الگ ہو گیا تھا ــــ جس نے ان کو ہفتوں مضطرب رکھا تھا۔ عقد کے ٹھیک دس ماہ کے بعد صاعقہ نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ سرکار دلھن نے پوتے کی چھٹی اتنی دھوم دھام سے کی کہ سارے شہر میں دھوم

بچ گئی۔ سرکار دلھن چاہتی بھی یہی تھیں۔ شہزاد کے عقد کی خبر سن کر ماہ رخ کو ذرا بھی ملال نہیں ہوا تھا۔ بظاہر ان کا اور صاعقہ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن جب انھوں نے اس کے ہاں بیٹا ہونے کی خبر سنی تو پہلی بار انھیں اپنی نادانی اور والدین کی جلد بازی پر افسوس ہوا۔

نواب بصارت ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ اخلاقی دباؤ ڈال کر شہزاد سے طلاق لے لیں گے۔ لیکن اب طلاق لینے کا بھی کوئی جواز نہیں رہا۔۔۔ مجبوراً انھوں نے چند معتبر لوگوں کو بیچ میں ڈال کر سرکار دلھن اور شہزاد میاں پر زور ڈلوایا کہ وہ ماہ رخ کو رخصت کرا کے جائیں۔ لیکن انھوں نے سختی سے انکار کر دیا۔۔۔ وہ اپنی بے عزّتی بھولے نہیں تھے۔ اور اب کسی قیمت پر اس رشتے کی تجدید نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر مہندی جان ان کی مدد نہ کرتی ۔۔۔ تو شہزاد میاں تاعمر گلے میں 'نامردی' کا طوق لٹکائے زندہ درگور رہتے۔ اور سرکار دلھن پوتوں کا منھ دیکھنے کو ترس جاتیں۔۔۔

پھر تو صاعقہ کے ہاں سال پیچھے بچّے ہونے لگے ۔۔ اور صاعقہ اپنے حسن و شباب کی قربانی دے کر ان نوخیز کونپلوں کی پرورش کرتی رہی۔ وہ تو یہ بھی فراموش کر چکی تھی کہ اس کا تعلق کسی ایسے خاندان سے تھا جہاں ہر 'مرد' ۔۔۔ 'اپنا مرد' ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو جو کچھ تھے ۔۔۔ شہزاد میاں تھے۔۔۔ اور بچّے تھے۔

شہزاد میاں کی تدفین کے بعد جب سب لوگ رخصت ہو کر چلے گئے ۔۔۔ تو چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت قبر کے نزدیک آئی ۔۔۔ اور اپنی کلائیوں میں پڑی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کو قبر کے

سرہانے بیٹھ کر توڑنے لگی .....

اس کے سہاگ کی واحد نشانی ـــ بس یہی چوڑیاں تھیں۔ جنھیں توڑ کر اس نے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کی آخری کوشش کی تھی ......

یہ ماہ رخ تھی ـــ شہزاد کی بیاہتا ..... ایک کنواری سہاگن۔
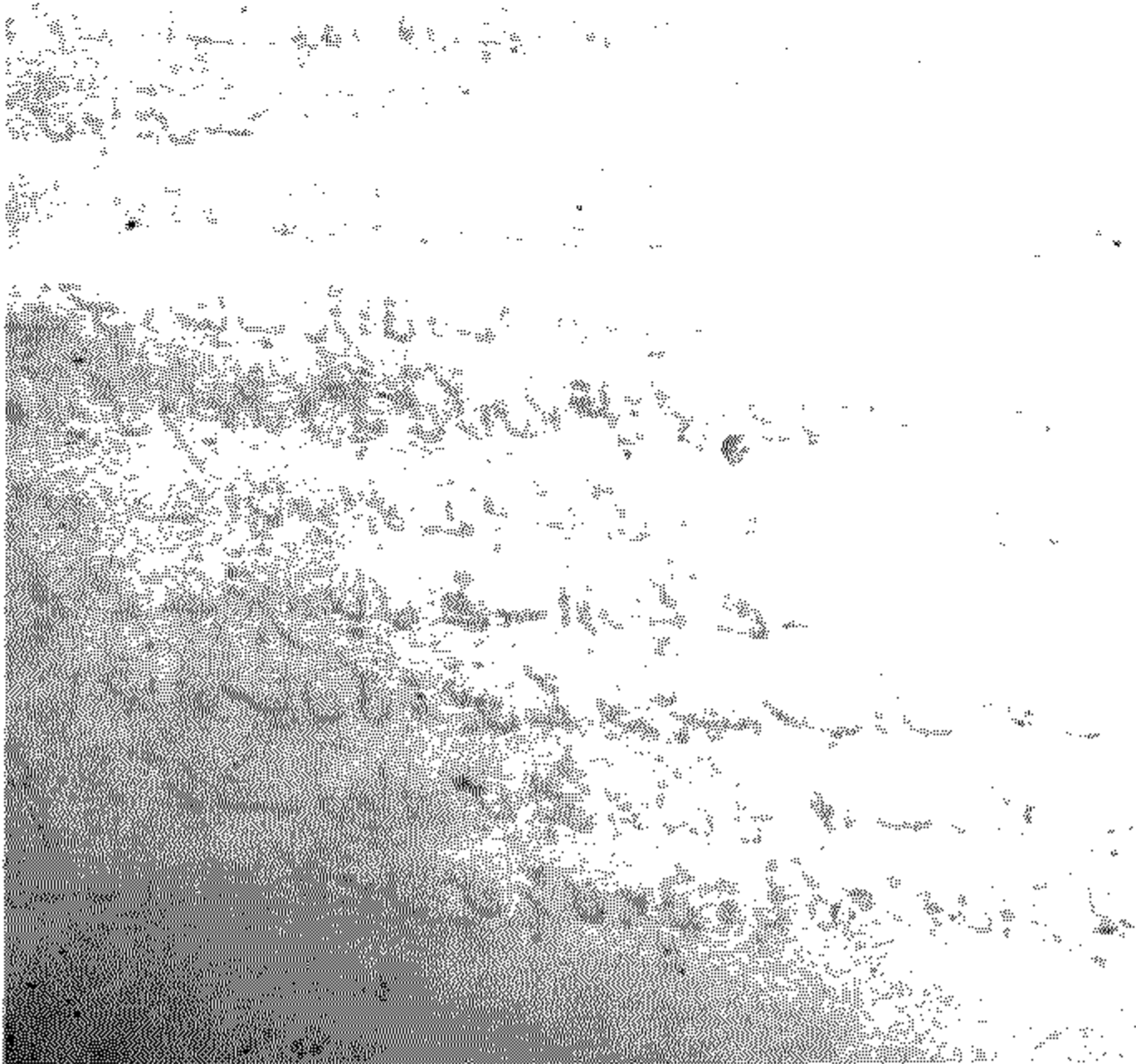
من کی آنکھیں

کماری کانتا سنگھ جس جگہ تبدیل ہو کر جاتیں ان کی شہرت ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتی۔ کانتا سنگھ سوشل ویلفیر کے محکمے میں عرصہ سے ملازم تھیں۔ ان کا تقرّر سائیکالوجسٹ (   ) کی پوسٹ پر ہوا تھا۔ گورنمنٹ کی اسکیم کے تحت یو۔پی میں پچاسوں ادارے چل رہے تھے اور تقریباً ہر جگہ ایک ہی بات پائی جاتی تھی۔ اسٹاف من مانی کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس طرح بدانتظامی ہونے سے گورنمنٹ کا لاکھوں روپیہ برباد ہو رہا تھا۔ اور جس مقصد کے لیے یہ ادارے کھولے گئے تھے وہ پورا نہیں ہو پا رہا تھا۔ لیکن کسی کو اندھے، بہرے، گونگے، اپاہج اور پاگل بچوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ سب لوگ اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ اور اگر اتفاق سے کوئی سخت گیر افسر آجاتا تھا تو وہ سب کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگتا تھا۔ کوئی اس سے تعاون نہ کرتا۔ اور ایسے حالات پیدا کر دیتا کہ وہ اپنی عزت

بچا کر وہاں سے چلا جاتا۔۔۔ بڑے افسروں کو ان باتوں کی ہوا تک نہیں لگنے
پاتی تھی۔۔۔ اور اسی طرح بدعنوانیاں بڑھتی رہتی تھیں۔۔۔۔

کانتا سنگھ بہت محنتی، ایمان دار سخت گیر اور مخلص تھیں۔ اس لئے
جلد ہی ان کا پرموشن ہوگیا۔۔۔ اور وہ سپرنٹنڈنٹ بنا دی گئیں۔ پہلے کی
بہ نسبت ان کو زیادہ اختیارات حاصل ہوگئے تو سب کو خیال ہوا کہ اب انھیں
افسرانہ شان اختیار کرنا پڑے گی۔۔۔ جو کہ ہر افسر کو کرنا پڑتی ہے۔ یعنی زیادہ
آرام۔۔۔ کم کام اور بہت سی باتوں کو نظر انداز کرنے والا رویہ اپنانا ہوگا۔
اس لیے کہ کرسی کی شان ہی اسی میں ہے۔۔۔ پہلے کی طرح دوڑ دوڑ کر
کام کرنے کے بجائے انھیں جم کر کرسی پر بیٹھنا پڑے گا۔

جب وہ اپاہج بچوں کے ادارے میں ٹرانسفر ہو کر آئیں تو پورا انتظام
ہی درہم برہم نظر آیا۔ سابقہ سپرنٹنڈنٹ اپنی فیملی کے ساتھ ہی رہائشی
حصے میں رہتے تھے۔ ان کے گھر کا سارا کام ادارے کے ملازم کرتے تھے۔ جنس،
سبزی بازار سے منگوانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ بچوں کے لیے جو سامان
ہر ماہ آتا تھا۔۔۔ وہ آدھا تو ان کی ضرورت پر صرف ہو جاتا تھا۔ دریاں،
کمبل، چادریں، تولیے، جھاڑن وغیرہ بھی ان کے ذاتی استعمال میں رہتے تھے۔ بچوں
کو اسکول لے جانا ہو یا ہسپتال، گھر کی صفائی کرنا ہو یا کھانا بنانا۔ سارا کام اسٹاف
کے لوگ کرتے تھے۔ بچوں کے نام سے منگائی گئی دوائیں ان کے گھر میں استعمال
ہوتی تھیں۔ ان سب سہولتوں کا انعام بھی اسٹاف کو ملتا تھا۔ کوئی ان سے
جواب طلب نہیں کرتا تھا۔ کام ہو یا نہ ہو۔

کماری کانتا غیر شادی شدہ تھیں۔ عمر بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن
وہ اپنے سینے میں ایک ہمدرد دل رکھتی تھیں۔ انھیں سماج کے ان ناکارہ نامکمل

— اور بیکار لوگوں سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ جہاں بھی گئیں ان بچوں پر اپنا پیار نچھاور کیا — سماج کے ان ناآسودہ، مجبور اور بے بس بچوں کے لیے ان کے دل میں ہمدردی ایثار اور محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ ان اپاہج بچوں میں انل تھا۔ بے حد خوبصورت بچہ، لیکن بچپن میں وہ پولیو کا شکار ہو گیا تھا۔ موہن کا بایاں ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹا ہوا تھا۔ نیتا، ششی، راکیش — محمد، رشمی — یہ سب بچے کسی نہ کسی طور سے دوسروں کے محتاج تھے۔ لیکن وہ اپنی معذوری کے باوجود سماج پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے — سرکار ان کی پوری مدد کر رہی تھی — ان کے آرام، غذا — دوا — کپڑے — اور تعلیم وغیرہ کا پورا انتظام تھا۔ ضرورت مندوں کو مصنوعی اعضا بھی مفت فراہم کیے جاتے تھے۔ اور انھیں اپنی معذوری کے احساس سے چھٹکارہ دلانے کا ہر جتن کیا جاتا تھا — لیکن سرکار کی اس کوشش میں روڑا اٹکانے والے بھی وہی انسان تھے۔ جو خود بھی ایک خاندان سے وابستہ تھے، جو انسانی رشتوں سے جڑے ہوئے تھے۔ مگر ان اپاہج اور معذور بچوں کے لیے ان کے دل میں ذرا بھی رحم نہیں تھا۔ رسوئیا بچا بچا کھانا بنا کر کھلا دیتا — بچے گندے میلے رہتے لیکن آیا انھیں نہلانے دھلانے میں آناکانی کرتی۔ نہ ان کی پڑھائی ڈھنگ سے ہوتی تھی اور نہ انھیں کام کاج سکھایا جاتا تھا — جب کوئی بڑا افسر یا منسٹر آجاتا تھا تو انسٹی ٹیوشن کے لوگ چند چیزیں بنا کر رکھ دیتے تھے کہ بچوں نے بنائی ہیں — بس کاغذات کی خانہ پری کر دی جاتی....

۷ ممتا ٹھکر نے اول روز ہی بچوں کا کھانا منگا کر خود دیکھا۔ کچی موٹی روٹیاں، پتلی پانی دال اور ابلی ہوئی سبزی دیکھ کر ان کا خون کھول اٹھا۔

رسوئیا کو تو گمان بھی نہیں تھا کہ مس صاحب کھانا منگا کر دیکھیں گی۔

"پنڈت جی! آپ میرے سامنے بیٹھ کر یہ کھانا کھائیے" — کانتا سنگھ نے حکم دیا۔ پنڈت جی نے چاچٹ چاندپر ہاتھ پھیرا۔ تھوک نگلا — پھر ہکلاتے ہوئے بولے —

"یہ .... یہ بھوجن ہم نہ کھیبے جی!" —

"کیوں؟ — اس لیے کہ یہ خراب ہے — نا — ؟" — لیکن جب بچے یہ کھانا کھا سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں کھا سکتے — اٹھالے جاؤ تھالی اور کان کھول کر سن لو کہ دونوں وقت سارا کھانا میں دیکھوں گی۔"

کانتا سنگھ نے اسٹور کیپر کو ہدایت کی کہ وہ سارا سامان اپنی نگرانی میں نکلوائے۔ جنس، سبزی، تیل، صابن سارا سامان پہلے وہ خود چیک کرتی تھیں۔ خراب سامان فوراً واپس کر دیتی تھیں — جن لوگوں کا کمیشن بندھا تھا۔ وہ ان کی جان کو روتے تھے۔ آیا اگر ایک دن بچوں کو نہ نہلائے تو فوراً اس سے جواب طلب ہو جاتا — اب ٹیچرز کو بھی دلچسپی سے پڑھانا پڑتا تھا۔ اور مختلف قسم کی دستکاریاں بھی سکھانا پڑتی تھیں۔ انتظام اتنا اچھا ہو گیا تھا کہ بچے اپنی بڑی دیدی کے نام کی مالا جپتے تھے۔ لیکن اسٹاف ان سے سخت ناراض تھا اور سب لوگ مل جُڑ کر کماری کانتا سنگھ کے خلاف سازش کرنے لگے۔ اور انھیں ذلیل کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

محکمے کے ڈائرکٹر معائنے کے لیے آنے والے تھے۔ کانتا سنگھ بڑی سرگرمی سے سارے انتظامات کروا رہی تھیں — دن رات کی محنت اور بھاگ دوڑ نے انھیں تھکا ڈالا تھا — لیکن وہ آرام کیے بغیر کام میں جٹی

رہتی تھیں ۔ اسٹاف کا بھی کام کرتے کرتے بُرا حال تھا۔ اور سب لوگ انھیں کوس رہے تھے ۔ اچانک کانتا سنگھ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ لیکن وہ بغیرؔ آرام کیے بدستور کام کرتی رہیں۔ ڈائریکٹر کے آنے سے ایک روز پہلے وہ اس قابل بھی نہیں رہیں کہ ذرا دیر آفس میں بیٹھ سکیں۔ مجبوراً اپنے رہائشی حصّے میں لیٹ گئیں ۔ لیکن ان کا ذہن ادھورے کاموں میں الجھا رہا۔ اور دماغی الجھن بڑھتی گئی ۔ انھوں نے جلدی جلدی کئی دوائیں اوپر تلے کھا لیں ۔ اور بنا کھائے صرف پانی ہی پر گزارا کرتی رہیں۔ جس دن ڈائریکٹر کو آنا تھا اس دن وہ بدقت تمام آفس میں آکر بیٹھ سکیں۔ اسٹاف موجود تھا۔ لیکن کئی کام ادھورے رہ گئے تھے۔ وہ بے چینی اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھیں ۔ رسوئیا کو تاکید کر دی تھی کہ کھانا جلدی سے بنا کر بچّوں کو کھلا دے تاکہ ڈائریکٹر صاحب لنچ کے بعد آئیں تو سب بچّے پوری طرح تیار ہوں ۔

لمبی سی میز کے چاروں طرف بچّے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے تھالیاں رکھی تھیں ۔ اور رسوئیا سبزی، دال، چاول اور روٹی ان کی تھالیوں میں ڈال رہا تھا۔ آج بچّوں کے لیے خاص طور سے کھیر بنائی گئی تھی۔

— کھانے کے بعد بچّوں کو کھیر دی گئی ۔ اچانک راکیش جو کسی کام سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ جلدی سے اندر آکر زور سے چلّایا —

"کوئی کھیر نہ کھانا ... کھیر میں زہر ہے ۔ زہر ہے "

رسوئیا نے لپک کر راکیش کو پکڑ لیا ۔

"بدماش! ٹھہر تو جا — ابھی تیرا گلا سا پھوڑ کر دوں"

"پنڈت جی! اسے چھوڑ دو"

کانتا سنگھ دروازہ میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ راکیش دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔

"بڑی دیدی — پنڈت جی نے کوئی چیز کھیر میں ملائی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے دیدی! شیشی اب بھی برتنوں کے ہودے میں پڑی ہے"

کانتا سنگھ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا.....

"پنڈت جی! تم ان زد دشش، بے بس اور مجبور بچوں کے جیون سے کھلواڑ کرنا چاہتے ہو۔؟ کیوں؟ — اس لیے نا کہ میں تم پر سختی کرتی ہوں — تم کو نیک اور ایماندار بنانا چاہتی ہوں۔ تم کو پاپ سے دور رکھنا چاہتی ہوں — ان اپاہج بچوں کا پیٹ کاٹنا پاپ ہے۔ پھر بھی تم یہ پاپ کرنا ہی چاہتے ہو تو تم کو کون روک سکتا ہے۔؟ بیشک تم مجھے زہر دے دو — مجھے مار ڈالو — دوشی میں ہوں — ان بچوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔؟ بولو — بولو"

کانتا سنگھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں....

کانتا سنگھ نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ اور بولیں....

"پنڈت جی! میں چاہوں تو تم کو ابھی پولیس میں دے دوں — لیکن میں تم کو سدھرنے کا ایک موقع اور دوں گی یہ ساری کھیر تم نالی میں بہا دو"

پھر انھوں نے پرس سے چند نوٹ نکالے اور اسٹور کیپر کو دے کر بولیں —:

" بچوں کو مٹھائی منگا کر بانٹ دو "۔

اس کے بعد ان سے وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ وہ اپنے رہائشی حصے میں آکر بستر پر گر پڑیں۔ اب ان کی ہمت بالکل ہی جواب دے چکی تھی۔ انھیں اپنی شکست کا احساس شدّت سے ہو رہا تھا۔ اور دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ڈائریکٹر تو کسی وجہ سے آنہ سکے۔ شام تک کانتا سنگھ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگیں۔ سارا اسٹاف ان کے پاس موجود تھا۔ لیکن وہ کسی کو پہچان نہیں رہی تھیں۔ سب لوگ بہت نادم تھے۔ ان کی بگڑی ہوئی حالت کے پیش نظر انھیں میڈیکل کالج لے جایا گیا۔ جہاں سے انھیں سِول ہاسپٹل بھیج دیا گیا۔ انھیں سخت دماغی صدمہ پہنچا تھا۔ ڈر تھا کہ ان کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔

اسٹاف کے سب لوگ باری باری ان کے پاس ہسپتال میں رہتے تھے۔ اور دل و جان سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ دو مہینے کے بعد انھیں ڈسچارج کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے انھیں مزید دو ہفتے آرام کرنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن انھوں نے چھٹی لینا منظور نہ کیا۔ اور اپنے اپاہج بچوں کے پاس واپس آگئیں۔ آج سارا اسٹاف ان کی راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا تھا۔ سب سے پہلے پنڈت جی نے آگے بڑھ کر ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا، اور ان کے پیروں کی طرف جھک کر بولے۔

" ہمیں چھما کر دیں مس صاحب "۔

کانتا جی نے انھیں روک دیا۔

" پنڈت جی۔ تم میرے پتا سمان ہو۔ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کرو "۔

"بی بی! میں پاپ کے راستے پر جارہا تھا۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں"۔

"آپ لوگوں سے میری ایک ہی بنتی ہے۔ کسی کام کو بوجھ نہ سمجھئے۔ سیوا ہی دھرم ہے۔ سیوا ہی من کو شانتی دیتی ہے۔ اور ان بچوں کو آپ کی ضرورت ہے"۔....

آج سب لوگ اپنی اس سخت گیر افسر کی عظمت کے دل سے قائل ہوگئے تھے۔ وہ ان بچوں کی کون تھی۔؟ جو ان کے لیے جان سے گذرنے پر تیار ہوگئی ۔۔۔ وہ بھی ان سے ہمدردی کرکے اپنی آتما کی شانتی کا سامان کرسکتے ہیں۔ اور سب لوگ ایک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ اپنے کلاس میں چلے گئے جہاں اپاہج اور معذور بچے ان کے منتظر تھے۔۔۔

من کی آنکھیں کھلیں تو خود غرضی، بغض ۔۔۔ اور نفرت سب جذبے ختم ہوگئے۔

بھرم

شادی کی تھکا دینے والی فضول سی رسموں سے پیچھا چھڑا کر منیر میاں سیدھے اپنے کمرہ کی طرف بھاگے۔ مانجھے سے لیکر دلہن کو بیاہ کر لانے تک، بلکہ اس کے بعد بھی ڈھیروں زیت رسموں سے نپٹنا پڑا تھا۔ تب جا کر کہیں آرام کرنے کی نوبت آئی ــ لیکن ــ وہ کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی بوکھلا گئے ــ سامنے ہی، اونچی سی مسہری پر، بیلے اور موتیا کی کلیوں کی جھالروں کے اس پار ــ ایک سرخ گٹھری سی نظر آ رہی تھی۔ جس کی سانسوں کا زیر و بم زندگی کا پتہ دے رہا تھا۔ وہ مسکرا پڑے۔ یعنی آرام کا خیال ہی خام ہے۔ سرخ گٹھری بڑے بے تکے پن سے دھری تھی، انہیں اس پر رحم سا آ گیا۔ انھوں نے دروازہ بند کیا اور آہستہ قدموں سے مسہری کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ آہٹ پا کر سرخ گٹھری کچھ اور سمٹ گئی، عطر، چوبا پھول، ابٹن ــ سب کی خوشبوئیں مل کر ایک عجیب سی خوشبو میں بدل گئی تھیں جن پر زمانے کی ساری خوشبوئیں نچھاور کی جا سکتی تھیں۔ یہ بے نام سی خوشبو

یہ انجانی سی جھجک سانسوں کے ساتھ منیر میاں کے رگ و پے میں سرایت کرتی جارہی تھی۔ اور وہ مدہوش سے ہوئے جارہے تھے۔ جیسے کئی جام چڑھا گئے ہوں۔ اپنا قدموں تک لوٹتا ہوا بھاری سہرا، اور موٹی سی بدھی وغیرہ اتار کر انھوں نے تخت پر پھینکی۔ کامدار ناگرے پیروں سے اتار کر مسہری کے نیچے کھسکائے۔ اور خود اضطراب کی کیفیتوں میں ڈوبے ہوئے اس ماہ رو کے پاس۔ بالکل پاس جا کر بیٹھ گئے اس کی سانسوں کا زیر و بم بڑا توبہ شکن تھا۔ اور اس کے دل کی دھک دھک انھیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ ذرا دیر قبل ہی وہ ان کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کے قریب بیٹھ کر انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دونوں جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے اسے مخاطب کرنا چاہا۔ تو سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیسے شروع کریں۔ پھر کچھ یاد آیا تو انھوں نے الماری سے ایک خوبصورت ڈبہ نکالا اور اپنی دلہن کے قریب بیٹھ کر انھوں نے ڈبے سے جڑاؤ کنگن نکالے اور اس کی طرف ذرا جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"سنا ہے کہ دلہن منھ دکھائی لیے بغیر اپنی صورت نہیں دکھاتی۔ اس لیے آپ کی منھ دکھائی حاضر ہے۔ قبول کریں۔"

دلہن نے ذرا سی جنبش کی تو اس کے جسم پر سجے ہوئے زیور ایک ساتھ بج اٹھے جیسے کئی ساز ایک ساتھ گنگنا اٹھے ہوں۔ منیر میاں نے دھیرے سے دلہن کے دونوں ہاتھ تھام لیے "اف اوہ۔ آپ نے تو ذرا سی بھی جگہ نہیں رکھی۔ آخر کیسے پہناؤں یہ کنگن۔؟"

گورے گورے گکھن ملائی جیسے گداز ہاتھوں میں سب سے پیچھے نکاح کی سبز کریلیاں تھیں اس کے بعد سرخ کامدار چوڑیوں کے درمیان سونے کی بانکیں۔ پھر ان کے آگے جڑاؤ پٹریاں۔ پھر جہانگیریاں۔ اس کے

بعد شیرو ہاں کڑے اور بس ہاتھ بھر گیا۔ منیر میاں نے پہلے آہستہ سے کریلیاں اور پکھ کائیں۔ پھر چوڑیوں۔ پٹریاں اور جہانگیریاں۔ پھر کڑے کھسکائے تب جا کر اتنی سی جگہ نکلی کہ انھوں نے کلائیوں میں جڑاؤ کنگن پہنا دیئے ذرا دیر میں دلہن کی حنائی ہتھیلیاں سج گئیں۔ حالانکہ انھوں نے بس

چند ہی منٹ کے لیے اس کے ننھے ننھے ہاتھ تھامے تھے۔ اور اب منھ دکھائی دینے کے بعد ــــ وہ اپنی عروس کی صورت دیکھنے کے حق دار بن گئے تھے۔ انھوں نے ماہی پشت کے جال کا سرخ کامدار دوپٹہ ہٹا کر صورت دیکھنا چاہی تو لال لال شوہے کا گھونگھٹ آڑے آ گیا۔ اسے اوپر کھسکایا تو جھکے ہوئے سر کے جڑاؤ جھپکے اور افشاں کے ذروں میں نظریں الجھ گئیں۔ یا اللہ !! کیسی مصیبت ہے دلہن کی صورت دیکھنا ؟ ــــ منیر میاں نے اس کی ٹھوڑی میں ہاتھ لگا کر چہرہ اونچا کیا تو بڑے بڑے آبدار موتیوں سے مزین کندن کے جڑاؤ ٹیکے سے سجی روشن پیشانی پسینے کے شفاف قطروں سے جھل مل کر رہی تھی۔ ننھی سی گلابی ناک میں پڑی سی نتھ تھی جس میں پڑے ہوئے سچے موتیوں کے درمیان سرخ چنی لو دے رہی تھی ــــ اور اس کے پتلے پتلے لبوں کی سرخی پھولوں کی پنکھڑیوں کی مانند شاداب تھی ــــ"

ماشاءاللہ ــــ چشم بد دور۔ آپ کتنی حسین ہیں۔ ایک بس ذرا سی آنکھیں کھول کر منھ دکھائی کا تحفہ بھی ملاحظہ کر لیں۔ میں اپنی آنکھیں بند کیے لیتا ہوں۔

منیر میاں نے سچ مچ آنکھیں بند کر لیں۔ ادھر منیر میاں نے یہ دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں کہ دیکھیں دلھن کیا کر رہی ہے۔ ادھر دلھن نے بھی یہ دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں کہ دولھا میاں سچ مچ آنکھیں بند کیے ہیں یا اس کو بہکا کر، اس بہانے اس کی آنکھیں کھلوانا چاہتے ہیں۔ اور بس اسی تا کا جھانکی میں دونوں کی نظروں کا تصادم ہو گیا۔ دلھن نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ لیکن منیر میاں اس ادا پر نثار ہو گئے اور ذرا بے تکلفی سے مخاطب ہو کر بیٹھے ــــ

"بس شرم ختم کیجیے ۔ اور بتایئے کنگن پسند آئے آپ کو ۔ ؟"

دلہن نے گردن ہلا دی ۔

"جی اس طرح کام نہیں چلے گا ۔ منھ سے بولئے ، ورنہ میں سمجھوں گا کہ میرا تحفہ آپ کو ناپسند ہوا ۔

"جی" ۔ مہین سی آواز میں جواب ملا ۔

"شکر ہے ۔ آپ بولیں تو ۔ ورنہ میں نے تو سن رکھا تھا کہ پہلی رات دلہن بولتی ہی نہیں ۔ پتہ نہیں سکھی سہیلیاں کیا الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر بھیجتی ہیں ۔ اب یا تو وہ پڑھانا ہی بھول گئیں ۔ یا ۔ آپ ہی کو یاد نہ رہا ۔"

منیر میاں نہ جانے کیا کہتے رہے ۔ اور ثروت آرا گھونگھٹ کے اندر مسکراتی رہیں سچ کنگن بہت خوبصورت تھے ۔ ننھے ننھے ہیروں کا جڑاؤ تھا ۔ پھر دولھا کا پہلا تحفہ تھا ۔ اس لیے ثروت آرا نے پورے خلوص و محبت سے اسے قبول کیا ۔ اور شوہر کے ساتھ ہی اسے بھی دل میں اتار لیا ۔

منیر میاں کی اماں بیگم نے ساری زندگی نئی نئی سوتوں کی جلن میں کڑھتے جلتے گزاری تھی اس لیے ادھر بیٹے نے اکیسویں سال میں قدم رکھا ادھر انھوں نے ان کے ماتھے پر سہرا سجا دیا ۔ ثروت آرا کے حسن و جمال نے منیر میاں کو اس کم عمری ہی میں اپنے شکنجے میں مضبوطی سے کس لیا ۔ اور اماں بیگم نے سکون کی سانس لی ۔ وہ تو یہی چاہتی ہی تھیں کہ بیٹا کسی اور طرف نظر ڈالنے کے قابل نہ رہے ۔ اسی لیے انھوں نے بڑی چھان بین کے ساتھ ثروت آرا کا انتخاب کیا تھا ۔ کہتے ہیں نئی دلھن کی للک مرد کو بس چند ہی روز رہتی ہے ۔ ادھر دلھن ذرا پرانی ہوئی اور میاں کا جنون ختم ہوا ۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا ہی تھا ۔ جیسے جیسے منیر میاں کی شادی کو دن گزر رہے تھے ۔ ثروت آرا سے ان کی محبت اور شیفتگی بڑھتی جا رہی تھی ۔ ذرا سی دیر کو بیوی نظروں سے اوجھل ہوتیں کہ وہ ان کو نظروں ہی نظروں

میں تلاش کرنے لگتے ـــ پھر بھی کہیں دکھائی نہ دیتیں تو وہ بیقرار ہو کر خود ہی ان کو ڈھونڈھنے نکل پڑتے اور وہ جہاں بھی ملتیں ـــ منیر میاں دس بہانوں سے ان کو بلا لاتے۔ ثروت آرا ان کی اس عادت سے عاجز و پریشان رہتی تھیں۔ اب وہ سارے وقت میاں کے پاس تو بیٹھنے سے رہیں ـــ گھر میں ڈھیروں کام تھے۔ کبھی کبھی تو ثروت آرا کو ان کی اس بے تکی محبت سے الجھن سی ہونے لگتی تھی ـــ ساس کا حال تو منیر میاں سے زیادہ برا تھا۔ جہاں وہ اسے کسی کام میں الجھے دیکھتیں کہ بس ہر دس منٹ کے بعد ٹوکتیں۔

"اے بہو صاحب ـــ منیر وہاں اکیلا گھبرا رہا ہوگا چھوڑ دو اسے۔ میں دیکھ لوں گی ـــ آخر کام میرے بچے سے بڑھ کر تو نہیں ہے"۔

ثروت آرا دل ہی دل میں ہنس پڑتیں ـــ

"ان بڑی بی نے تو بیٹے کو اور بھی چھچھوندا بنا رکھا ہے"۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھیں۔ اور دل سے میاں کی محبت کی قدر کرتی تھیں ورنہ دستور تو یہ تھا کہ رئیس زادوں کے دن احباب میں گزرتے تھے ـــ اور راتیں بازار والیوں کے ساتھ ـــ منیر میاں کا کوئی دوست ایسا نہیں تھا جو دن رات ان کے پیچھے لگا رہتا۔ اور راتوں کے ایک ایک لمحہ کا حساب ثروت آرا کے پاس رہتا تھا۔ ایک عورت کو اور کیا چاہیے تھا ـــ"۔

پہلی اولاد ـــ وہ بھی لڑکا ـــ ثروت آرا اور منیر میاں بیٹے کی پیدائش پر نہال ہو گئے۔ تنویر کی چھٹی پر خوب دھوم دھام ہوئی ـــ علی ماموں نے اپنی طرف سے زہرہ بائی کا مجرا کرایا ـــ شادی بیاہ ہویا .... چھٹی چھوچھک ـــ بغیر رنڈی کے ناچ کے مزہ بھی تو نہیں آتا تھا۔ پھر علی ماموں تو ناچ گانے کے رسیا تھے۔ ساری نامی گرامی طوائفوں کی ہسٹری انھیں ازبر تھی ـــ اس وقت زہرہ بائی کا مجرا کرانا بھی گویا

دولت مندی کی دلیل تھی ۔۔ وہ بہت اونچی طوائف تھی ۔ ایک مجرے کے کئی ہزار لیتی تھی ۔ عام رنڈیوں کی طرح ساری رات ناچنا اس کے اصول کے خلاف تھا ۔ بس بیٹھے بیٹھے ایک آدھ ٹھمری اور غزل سُناتی ۔ اور جب گھنگھرو باندھ کر کھڑی ہوتی ۔۔ تو اچھے اچھے دل تھام لیتے ۔

پھر بھلا منیر میاں کی کیا بساط تھی ۔ وہ تو علن ماموں کو دعائیں دے رہے تھے جنھوں نے زہرہ کا مجرا کرا کے اس محفل میں چار چاند لگوا دیے تھے ۔

زہرہ بہت حسین نہیں تھی ۔ بس واجبی سی صورت تھی ۔ لیکن اس کا جسم بہت خوبصورت تھا ۔ اور رقص کرتے ہوئے یہ جسم ایسی ایسی قیامتیں ڈھاتا تھا کہ لوگوں کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی تھیں اور حسین صورتوں کا جادو اس کی دلبرانہ اداؤں سے اتر جاتا تھا ۔۔ اس رات نہ جانے کتنی حسیناؤں کا جادو اتر گیا ۔۔ اور دوسرے دن تو کیا ۔۔ کئی دن تک رئیس زادے مدہوش رہے ۔ زہرہ کا جادو اپنا کام کر چکا تھا ۔

ثروت آرا ننھے تنویر کے دُلار کر رہی تھیں کہ منیر میاں نے آکر بڑی عجلت میں کہا ۔

" بیگم ! ذرا میرا بکس درست کر دو ۔۔ شام سے پہلے مجھے علاقہ پر پہنچنا ہے ۔۔ بڑے صاحب شکار کھیلنے آرہے ہیں ۔۔ "

ثروت آرا نے ان کو پہلے کبھی ایسا بدحواس نہیں دیکھا تھا ۔ شاید یہ اضطراب اس لیے تھا کہ شادی کے بعد وہ پہلی بار ان سے جدا ہو رہے تھے اور بڑے صاحب بھی کسی خاص اہمیت کی حامل شخصیت تھے ۔ ورنہ روز کوئی نہ کوئی افسر علاقہ پر شکار کھیلنے آتا رہتا تھا ۔ ملازم خود ہی سارا

سارا انتظام کر لیتے تھے۔ منیر میاں زحمت نہیں کرتے تھے۔ ثروت آرا نے بکس میں کپڑے رکھے اور وہ اماں بیگم سے امام ضامن بندھوا کر اور بیوی سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ امام دین خدمت گار ان کے ہمراہ گیا تھا۔ ثروت آرا کو میاں کی جدائی بہت کھل رہی تھی۔ لیکن ننھے تنویر نے ان کو بہلائے رکھا اور منیر میاں پورے ڈیڑھ ہفتہ کے بعد واپس آئے تو بےحد ہشاش بشاش تھے۔ بیوی سے ویسی ہی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ جدائی کے شکوے کیے، ہجر کی راتوں کا تذکرہ کیا اور ثروت آرا ساری کلفت بھول گئیں۔

ثروت آرا کو کسی تقریب میں جانا تھا۔ لباس کی مناسبت سے زیورات کا انتخاب کرنے کے لیے صندوقچہ کھولا تو دھک سے رہ گئیں۔ جڑاؤ پازیب اور نورتن سیٹ غائب تھا۔ انھوں نے کئی بار صندوقچہ دیکھا۔ الماری، بکس اور بڑے کمرہ کا ایک ایک گوشہ دیکھ ڈالا ــــ لیکن زیور نہ ملنا تھے نہ ملے۔ کسی ملازم کا ان تک پہنچنا ناممکن تھا۔ منیر میاں پر شک کرنا خود اپنے آپ پر شک کرنے کے مترادف تھا۔ انھوں نے شوہر اور ساس سے زیورات کی چوری چھپا ڈالی۔ خدا جانے وہ لوگ کیا سوچیں؟ ــ زیور تو اتنا تھا کہ کوئی چیز ایک بار پہن لیتی تو دوسری بار پہننے کی نوبت نہ آتی ــ لیکن یہ بھی تو اچھی بات نہیں تھی کہ اتنے قیمتی زیورات بند صندوقچے سے آنکھوں کے سرمہ کی طرح غائب ہو جائیں۔

منیر میاں جو پہلے کبھی پلٹ کر علاقہ کی خیر خبر نہیں لیتے تھے۔ اب انھیں اس سے عشق ہو جارہا تھا۔ کبھی باغ لگوانے جا رہے ہیں ــ کبھی لگان کی وصولی کا قضیہ ہے ــ کبھی پیداوار کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ سیر و شکار

تو خیر روز کی بات تھی ــــ ثروت آرا شوہر کی اس تبدیلی کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں ۔ــ لیکن وہ شکایت کر کے خود کو ان کی نظروں میں سبک نہیں کرنا چاہتی تھیں ــــ اور ادھر صندوقچہ تھا کہ روز بہ روز خالی ہوتا جا رہا تھا ــ رفتہ رفتہ یہ راز ـــــ راز نہ رہا کہ زیور دراصل زہرہ بائی کے پاس پہنچ رہا ہے ۔ اور علاقہ پر زہرہ بائی کا راج ہے ۔ یعنی منیر میاں اپنی اماں بیگم کی ساری پیش بندیوں کے باوجود اپنے باپ کی روش پر چلنے سے باز نہ رہ سکے ۔ ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور ذرا سی کھانسی کا دورہ موت کا بہانہ بن گیا ـــــ اور ثروت آرا شوہر کی بے راہ روی برداشت کرنے کو تنہا رہ گئیں ـــــ دن بہ دن ان کی صحت خراب ہوتی گئی ۔ چند برسوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئیں ۔ ان کے مقابلہ میں منیر میاں بے حد تندرست اور سرخ و سپید تھے ۔ صحت ایسی اچھی تھی کہ ان سے سات برس چھوٹی ثروت آرا پندرہ برس بڑی لگتی تھیں ۔ اور ان کا وہ حُسن جس نے کبھی منیر میاں کو دیوانہ بنا رکھا تھا ۔ اب داستانِ پارینہ بن چکا تھا ۔ ایسی حالت میں منیر میاں کو ان سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا ۔ . . بیوی کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی اور وہ زہرہ کی باہوں میں پناہ لینے علاقہ پر چلے جاتے تھے ۔ جس کا جسم پہلے سے زیادہ پرکشش ہو گیا تھا ۔ اور اداؤں میں ایسی قاتلانہ محبوبیت تھی کہ اس کے سامنے ایک ثروت آرا کیا زمانہ کی ساری مہ جبینیں بیکار تھیں ۔

ثروت آرا کی حالت اس دن کچھ زیادہ ہی خراب تھی ـــ منیر میاں علاقہ پر جانے والے تھے ۔ لیکن ان کی حالت دیکھ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ۔ محبت نہیں ـــ انسانیت کے ناتے وہ ان کے پاس رک گئے ۔ کیا پتہ کس وقت ان کا چراغ ہستی

گُل ہو جائے۔

ایک مدت کے بعد ثروت آرا نے شوہر کو اپنے قریب پایا تو نہ جانے کیا کیا یاد آگیا۔ وہ پہلی رات جب وہ دلھن بن کر یہاں آئی تھیں۔ منھ دکھائی دیتے وقت میر میاں نے ان سے کیسی پیاری پیاری باتیں کی تھیں۔ پھر اس کے بعد کے خوش گوار لمحات جب شب و روز ایک دوسرے کی قربت میں بسر ہوتے تھے۔ کاش وہ دن سدا رہتے۔ لیکن بہاریں تا بکے ---؟---

ثروت آرا کی آنکھوں میں آنسو آگئے --- اور انھوں نے اپنا زرد سوکھا ہوا ہاتھ میر میاں کے ہاتھ میں دے دیا۔ میر میاں کا دل بھیج گیا۔ جی چاہا کہ ان کو تسلی دیں لیکن --- جھوٹی تسلی کے لیے بھی تو الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کا ہر خوبصورت لفظ زہرہ کی نذر کر چکے تھے۔ اس لیے کچھ نہ کہہ سکے---

"میر تاج! جی چاہتا ہے کہ آج پھر ایک بار آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے وہی کنگن پہنا دیں ---"

میر میاں نے صندوقچہ کھولا --- وہاں خاک اڑ رہی تھی --- بس خالیں ڈبے میں کنگن رکھے تھے --- یہ کنگن --- ؟ یہ کنگن بھی --- ؟ لیکن اچھا ہے کہ بھرم بنا رہے --- ورنہ ثروت یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں گی۔

میر میاں نے کانپتے ہاتھوں سے ثروت کو کنگن پہنا دیئے۔ ثروت آرا کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی --- میر میاں کا دل تڑپ اٹھا --- انھوں نے آہستہ سے ثروت کا ہاتھ تھام کر کہا ---

"بیگم --- تم کو یہ کنگن بہت عزیز ہیں نا؟"

"جی ہاں --- بہت --- بہت زیادہ" ---

"مجھے معاف کر دو بیگم ـــــ یہ کنگن نقلی ہیں ـــ بالکل نقلی ـــــ اصلی کنگن بھی اور زیوروں کی طرح میں نے زہرہ کو دیدیے ـ ان کی جگہ یہ نقلی کنگن بنوا کر رکھ دیے ـــ مجھے معلوم تھا کہ تم کو یہ کنگن بہت عزیز ہیں ۔"

شاید منیر میاں کا ضمیر اس لمحہ بیدار ہو گیا تھا ـــ

"ہاں مجھے معلوم تھا کہ آپ یہ کنگن بھی زہرہ کو دیدیں گے ـــ یہ خیال کیے بغیر کہ آپ نے شادی کی پہلی رات منھ دکھائی میں تحفہ کے طور پر دیئے تھے ـــ اور میں نے پہلے ہی اصلی کنگنوں کی جگہ نقلی کنگن بنوا کر رکھ دیے تھے ـ جو کنگن آپ نے زہرہ کو دیے وہ نقلی تھے ـــ اصلی کنگن تو یہ ہیں ـــ میرے ہاتھوں میں، آپ والے نقلی کنگن الماری میں پڑے ہیں "ـــ

ـــــ ثروت آرا نے رک رک کر بڑے فخر و غرور سے کہا ـــ جیسے اپنے کنگن بچا کر انھوں نے کوئی بڑا معرکہ سَر کیا ہو ـــ اور منیر میاں نے تو بس یہ سُنا کہ جو کنگن انھوں نے زہرہ کو دیے وہ نقلی تھے ـــ اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گئے ـــ اور برسوں کا بنا ہوا بھرم ـــ پل کے پل میں ٹوٹ گیا ـ

ثروت آرا ہکا بکا سی یہ سوچتی رہ گئیں کہ کس کا بھرم ٹوٹا تھا ـــ ؟

ان کا ؟ ـــ یا منیر میاں کا ـــ ؟

مات

خبر تھی یا نیزہ کی انی ..... جس نے کلیجے کو چھید کر رکھ دیا ..... اور وہ تڑپ اٹھیں۔

یہ تو کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نواب شاندار جاہ، سپہر آرا بیگم جیسی حسین اور نازک بیوی کی موجودگی میں کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھیں گے۔ لیکن وہاں تو انھوں نے سب کی امیدوں پر پانی ہی پھیر دیا اور ایک ایسی عورت سے منتخر کر بیٹھے، جس سے دوسرے لوگ خدمت لیتے بھی ہچکچاتے۔

ذمرد حبشی نژاد تھی۔ بے حد گرانڈیل ..... اور بھر پیٹ کالی۔ اس کا کام دسترخوان پر سب کے ہاتھ دھلانا تھا ___ اور حمام کا انتظام بھی اسی کے ذمے تھا۔ موسم کے لحاظ سے پانی، خوشبوؤں، صندل اور ابٹن وغیرہ کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ وہ بیگمات کو غسل کرنے میں بھی مدد دیتی تھی ___ بڑے بڑے آب گرما، دیگیں، مٹکے ___ لوٹے ___ سلفچی اور آفتابے اسی کی نگرانی میں

رہتے تھے۔ کیا مجال جو کسی کو اس سے شکایت ہو۔ وقت پر ہر چیز تیار ملتی۔ ہر برتن صاف ستھرا۔ جگر مگر کرتا ــــ اور خوشبودار پانی سے چھلکتا رہتا۔ اور ان خدمات کے صلے میں اس کو انعامات سے نوازا جاتا۔ بالخصوص شادی بیاہ اور چھٹی چھوچھک کے موقعوں پر تو زمرد نہال کر دی جاتی۔ گوٹے کناری کے رنگا رنگ گھیر دار لہنگوں، ڈوپٹوں اور چاندی کے جھل جھلاتے زیوروں سے اس کا بڑا سا صندوق اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔

کسی زمانے میں سیکڑوں حبشنیں نوابین اور رؤسا کے ہاں ملازم تھیں۔ ان کا کام محرم میں امام باڑوں میں نوحہ خوانی کرنا تھا۔ ان کی سینہ زنی دیکھ کر اچھے اچھے مردوں کا پتہ بھی پانی ہو جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ دوسری خدمات بھی انجام دینے لگیں ــــ زمرد کی ماں الماس، شاندار جاہ کی والدہ کے پاس باری داروں میں ملازم تھیں۔ رات میں جب وہ آرام کرتیں تو الماس کئی کئی گھنٹے ان کے ہاتھ پیر دباتی رہتی تھی ــــ دوسری باری داروں کی طرح انھیں بار بار دہوں، کہہ کر ان کی سست رفتاری پر تنبیہ نہیں کرنا پڑتی تھی۔ اس کے مضبوط اور سدھے ہوئے ہاتھ منتقل ــــ ایک رفتار سے ان کی کمر اور پنڈلیوں پر مکیاں لگاتے رہتے ــــ اور وہ بڑے مزہ سے آرام کرتی رہتیں۔ زمرد بھی اپنی ماں الماس کی طرح کام میں بجد چاق و چوبند رہتی تھی ــــ

شاندار جاہ اپنے نام کی مناسبت سے بہت خوبرو اور وجیہ و شکیل تھے۔ بچپن سے باپ کے ساتھ اکھاڑے میں کسرت کرتے تھے۔ ان کا سڈول اور کسرتی جسم ان کی برسوں کی ریاضت کا انعام تھا۔ اب بھی وہ روزانہ صبح کئی سو بیٹھکیں لگاتے اور ڈنڑ پیلتے ــــ پیروں وہ ڈوبی جاتے ــــ اور

ڈھیروں بادام نوش کر جاتے۔ ان کی غذا بھی خاص احتیاط اور اہتمام سے تیار کی جاتی تھی۔ ان کی اماں حضور اپنی نگرانی میں ان کے لیے مقوی غذائیں تیار کراتی تھیں۔ شاندار جاہ کی شادی کے بعد بھی وہ بدستور بیٹے کا خیال رکھتی تھیں۔ دھان پان سی بہو صاحب تو خود ہی پھولوں میں تولنے کے قابل تھیں۔ ان سے کسی خدمت اور محنت کی توقع کرنا ہی غلط تھا۔ شاندار جاہ تو ان کے قریب آنے میں بھی بڑی احتیاط برتتے تھے۔ اور شاید اسی جسمانی فرق نے ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کی تھی۔

سپہر آرا اپنے میکے میں تھیں۔ زمرد نے حسب معمول حمام درست کر کے شاندار جاہ کو اطلاع کر دی۔ اور کسی دوسرے کام میں مصروف ہو گئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج اس نے ان کی کھڑاؤں کی جوڑی نہیں رکھی۔ جو وہ غسل کے بعد پہنتے تھے۔ جھٹ پٹ اس نے کھڑاؤں الماری سے نکال کر غسل کی چوکی کے نزدیک رکھی اور باہر نکل ہی رہی تھی کہ اندر آتے ہوئے شاندار جاہ سے ٹکرا گئی۔ لوہے سے لوہا۔ اور پتھر سے پتھر رگڑنے سے جو آگ پیدا ہوتی ہے۔ اس آگ کو شاندار جاہ نے بھی محسوس کیا۔ اور انھوں نے زمرد سے متعہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نکاح کر کے وہ اپنی نازک اور حسین بیگم کو دکھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ اور نہ ان کے منصب و مرتبے کی تذلیل ہی انھیں مقصود تھی۔ یہ متعہ بھی بس اپنی ضرورت کے تحت کیا تھا۔ اس سے زمرد کا رتبہ نہیں بڑھتا تھا۔ بلکہ اس کی کمتری ثابت ہوتی تھی۔ لیکن جب سپہر آرا کو اس کی خبر ہوئی تو وہ مارے صدمہ کے غش کھا گئیں۔

شاندار جاہ نے ان کی علالت کی خبر سنی تو وہ خود بیگم کو میکے سے لینے گئے۔ اپنی محبت اور وفاداری کا یقین دلایا۔ ان کے مقام اور رتبہ کے تحفظ کی قسمیں کھائیں۔ ان کے حقوق کی برتری تسلیم کی۔ لیکن بیگم ان قسموں اور وعدوں

سے نہ بہلیں۔ ان کی تو ایک ہی ضد تھی ـــ

"آپ زمرد کو چھوڑ دیجیے۔ ورنہ مجھے میرے حالوں رہنے دیجیے۔ مروں یا جیوں آپ کی بلا سے ـــ"

"اس طرح ضد کر کے تو آپ خود ہی اس کی اہمیت بڑھا رہی ہیں بیگم۔ ورنہ اس کا اور آپ کا کیا مقابلہ ـــ"

"جو بھی سمجھئے ـــ میں اسے ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمارا تسلہ لوٹا اٹھانے والی ہماری سوکن بنی رہے۔ آپ کے اوپر راج کرے اور ہم بس خالی خولی اپنا رتبہ اور اپنا حق لیے بیٹھے رہیں۔ حق تو اس کا ہے جو بیاہ کر لائے ـــ دل سے اتری بیوی ـــ اور پیر سے اتری جوتی میں فرق ہی کیا ہے ـــ؟"

سپہر آرا کی ضد ماننا ان کے بس کی بات نہیں تھی ـــ وہ زمرد کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے ـــ وہ اب ان کی ضرورت بن چکی تھی۔ مفاہمت کی کوئی صورت نہ دیکھ کر انھوں نے مجبوراً بیوی کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ـــ لیکن ان سے بالکل ہی کنارہ کشی اختیار نہ کر سکے۔ کیونکہ وہ صرف ان کی بیوی ہی نہیں تھیں ـــ ان کے حقیقی چچا کی بیٹی اور ان کے ٹھیکرے کی منگیتر بھی تھیں ـــ اتنے سارے رشتوں کو فراموش کرنا بھی ناممکن تھا ـــ وہ بیوی اور بیٹے پیکر جاہ سے ملنے آتے رہے ـــ اور اپنی طرف سے ان رشتوں کی استواری میں کوئی کمی اور کوتاہی نہیں کی۔ البتہ سپہر آرا سوکن کا کانٹا اپنے کلیجے میں رکھ کر میاں سے کبھی صاف دل سے نہ ملیں ـــ جب بھی سامنا ہوتا وہ طعنوں کے تیر اور طنز کے نشتر چلانے سے باز نہ رہتیں۔ شاندار جاہ ان کے سارے وار ہنس ہنس کر اپنے چوڑے سینے پر روک لیتے ـــ اور واپس اسی جائے پناہ میں پہنچ جاتے ـــ جہاں زمرد ان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ان کی منتظر ہوتی ـــ اس کی خدمت اطاعت اور محبت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا۔

سپہر آرا بیگم تو ان پرانی رسموں کو کوستی تھیں ـ جہاں گھٹنے پوتڑوں پر ننھے ننھے، معصوم بچوں کی منگنی کر کے ان کی قسمت کے فیصلے کر دیے جاتے تھے ـ اور اکثر یہ فیصلے غلط ہی ثابت ہوتے تھے ــ لیکن ٹھیکرے کی مانگ خدا کا فرمان بن جاتی تھی ـ جس کے آگے کسی کو زبان ہلانے کی اجازت نہیں تھی ـ ان کا انجام بھی اسی غلط فیصلے کا رہون منت تھا ـ ننھے بیکر جاہ کی منگنی بھی شاندار جاہ نے اپنی بھانجی سے کر دی تھی ــ بھانجی صاحبہ اس وقت صرف چھ یوم کی تھیں ـ اُدھر ان کی اتی حضور نے انھیں گود میں لے کر تارے دیکھے ـ ادھر ان کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا ـ اور نند نے چھ دن کی گلابی گلابی متی سی گڑیا کو ــ جو پڑ اسنے کی گوٹ والی سُرخ رضائی میں لپٹی ہوئی تھی ـ بھاوج کی گود میں دے کر ہنستے ہوئے کہا ــ

" لیجئے بھابی صاحب ــ سنبھالیے اپنی بہو کو " ــ

سپہر آرا نے بھی شوق اور محبت سے اس ننھی سی بہو کو کلیجے سے لگا لیا ـ اور نند نے بیکر جاہ کو لے کر پیار کیا ـ بلائیں لیں ــ اور ہنسی خوشی منگنی کی رسم ادا کی گئی ــ یوں بیکر جاہ کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو گیا ــ

جب سے شاندار جاہ نے زمرد سے متعہ کیا تھا ـ سپہر آرا کا ارادہ بھی ڈانوا ڈول ہو رہا تھا ــ وہ اپنے بیٹے کو کسی رسم میں باندھ کر ــ اسے مجبور کر کے شادی کرنے کے خلاف تھیں ـ اس کی وجہ بھی روز روشن کی طرح عیاں تھی ــ

بیکر جاہ اپنے باپ ہی کی طرح خوبرو اور قد آور نکلے تھے ـ ان کے مقابلہ میں ان کی منگیتر گیتی آرا بہت معمولی صورت شکل کی تھیں ـ کچھ مرشد آباد والوں کا اثر زیادہ آیا تھا ـ ان کے نند دئی ــ نواب مرشد آباد کے قریبی عزیزوں میں تھے ـ جس پر ان کی نند خوب اتراتی تھیں ـ اب بیٹی میں ددھیال کا رنگ روپ آیا تو ساری شیخی بھول گئیں ــ انھیں بار بار یہ خیال ستاتا تھا

کہ کہیں ناراض ہو کر بھاوج سرے سے شادی ہی سے انکار ہی نہ کر دیں۔ ایک تو شوہر کے مقدر کا صدمہ ——— اوپر سے گیتی آرا کی بد صورتی ——— اور اسی لیے وہ بھاوج کی للو پتو میں لگی رہتی تھیں۔ ہر تیوہار پر پیکر جاہ کے لیے قیمتی ملبوس، تحائف، مٹھائی اور نقدی ضرور بھیجتی تھیں۔ بھاوج سے ملنے آتیں ——— تو پیکر جاہ پر صدقے واری ہوتیں ——— اور دبی زبان سے رشتے کی یاددہانی بھی کرا دیتیں۔ جسے سن کر سپہر آرا ان سنی کر دیتیں۔

ایک روز پیکر جاہ ماں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے خاصہ نوش کر رہے تھے ——— چھٹّی نویس کی لڑکی ثمرؔ نے جھجک سے دسترخوان پر گرم گرم چپاتیاں لا کر رکھیں اور پیکر جاہ کو دیکھ کر جھینپ کر جلدی سے واپس چلی گئی۔ سپہر آرا نے پیکر جاہ کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دیکھی ——— اور یہ بھی غور کیا کہ وہ ثمرؔ کو دزدیدہ نظروں سے اس وقت تک دیکھتے رہے۔ جب تک وہ باورچی خانہ میں نہ چلی گئی ——— ان کے دل میں ہنسی کا بلبلہ سا اٹھا ——— اور ہونٹوں پر آ کر پھوٹ گیا ——— اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے انھوں نے بڑے پیار سے پیکر جاہ کو دیکھا۔ ماشاءاللہ مسیں بھیگ رہی تھیں ——— اور اتنے اچھے ہاتھ پاؤں نکالے تھے کہ اپنی عمر سے کئی سال بڑے لگ رہے تھے۔ اس عمر میں صنفِ نازک سے دلچسپی ہونا فطری بات تھی۔ اور اب انھیں محسوس ہوا کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں ہیں ——— تو دل میں ڈھیروں ارمان کروٹیں لینے لگے۔ اور پیکر جاہ پر انھیں ٹوٹ کر پیار آیا ——— اور وہ ان کے سامنے فرنی کی ڈش رکھ کر بڑے اصرار اور محبت سے انھیں کھلانے لگیں۔

ثمرؔ کی ماں چھٹّی نویس تھیں ——— ان کے ذمے گھر کا کل حساب کتاب تھا اس کے علاوہ وہ اپنی نگرانی میں باورچی خانہ کے لیے جنس تلواتیں۔ گاؤں سے اناج آتا ——— تو سب ہوا پھٹکوا کر توشہ خانہ میں رکھواتیں ——— اس طرح عام ملازموں سے ان کا درجہ اونچا تھا ——— پھر ذات رات کی بھی اچھی تھیں ———

ان کے شوہر ایرانی تھے ۔ کسی میں حصول تعلیم کے لیے آئے تو یہاں کی تہذیب تمدن نے ان کے قدم تھام لیے ۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے یہیں بس گئے ۔ شادی بھی یہیں کے ایک سیّد گھرانے میں کر لی ۔۔۔ ان کے انتقال کے بعد بیوی کو زندگی گذارنے کے لیے ملازمت کرنا پڑی ۔ لیکن یہ ملازمت بھی باعزت تھی ۔ اور وہ اپنی اکلوتی بیٹی ثروت کو آنکھ کی پتلی بنا کر رکھتی تھیں ۔۔۔ محل کی بیگمات بھی چھٹّی نویس کے رویے کی وجہ سے ثروت سے خدمت لینے کی ہمّت نہیں کرتی تھیں ۔۔۔ بلکہ اس کا ایرانی حُسن اور شریفانہ رکھ رکھاؤ دیکھ کر مارے حسد کے خود ہی اس سے الگ تھلگ رہتی تھیں ۔ جب سے سپہر آرا پر غم کا پہاڑ ٹوٹا تھا ۔ چھٹّی نویس ان کا بہت خیال رکھتی تھیں ۔۔ تاکہ بھاوجوں کے بیچ انھیں کسی قسم کی کمی کا احساس نہ ہو ۔ انھوں نے ثروت کو بھی نصیحت کی تھی کہ سپہر آرا کا کام کاج کر دیا کرے ۔ اور اسی لیے کبھی کبھی ثروت کا سامنا پیکر جاہ سے بھی ہو جایا کرتا تھا ۔

سپہر آرا بیگم فجر کی نماز کے بعد چہل قدمی کرنے کے لیے پائیں باغ میں گئیں ۔ تو چنبیلی کی گھنی جھاڑیوں کے اُس پار انھیں پیکر جاہ کی آواز سُنائی دی ۔

" ثروت جہاں ! ۔ میں آپ کو پسند کرتا ہوں ۔ لیکن یہ بات میں اپنی امّاں حضور سے نہیں کہہ سکتا ۔۔۔ وہ ابّا حضور کی وجہ سے کتنی افسردہ رہتی ہیں ۔ اب میں بھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کروں ۔ تو وہ اور بھی پریشان ہو جائیں گی ۔ اور یہ بات تو آپ جانتی ہی ہیں کہ ہماری منگنی بچپن ہی میں پھوپھی جان کی صاحبزادی سے ہو چکی ہے ۔ اگر امّاں حضور کا حکم ہوا تو ہمیں سرتابی کی مجال نہ ہوگی ۔۔۔ "

" میں آپ کو کسی ایسی بات کا مشورہ نہیں دوں گی صاحبزادہ پیکر

جس سے آپ کی اماں حضور کی دل شکنی ہو ۔"

"مجھے آپ سے یہی امید تھی ثروت جہاں ۔۔۔ اسی لیے میں نے آپ کے سامنے آج اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے ۔۔۔ اور آپ میری طرف سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں ۔۔۔ یہ بات بھی مجھے منظور نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے اپنی اماں حضور اور ان کی خوشی سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہیں ہے ۔"

"میں آپ کے خیالات کی قدر کرتی ہوں ۔ یقین مانیے اگر مجھے آپ کی شرافت پر بھروسہ نہ ہوتا ۔۔۔ تو اس طرح یہاں آپ سے ملنے نہ آجاتی۔ بس آپ سے میری یہی التجا ہے صاحبزادہ کہ ۔۔۔ آپ خود پر قابو رکھا کریں۔ میری رسوائی سے آپ کو بھی تکلیف ہو گی ۔"

"شاید آپ کا اشارہ میری نظروں کی بیتابی اور گستاخی کی طرف ہے ۔۔۔ جو اماں حضور کی موجودگی کے باوجود ۔۔۔"

"آئندہ میں بھی احتیاط برتوں گی کہ آپ کے سامنے نہ آؤں ۔"

"کاش ۔۔۔ میں آپ کی اس زیادتی کے خلاف آواز اٹھانے کی قدرت رکھتا ۔۔۔ ہمارے محلوں کا بھی عجیب اصول ہے ثروت جہاں! عیاشی کے نام پر یہاں کوئی بات عیب نہیں ہے۔ لیکن شرافت اور محبت کے ساتھ کوئی کسی کا ہاتھ تھامنا چاہے ۔۔۔ تو قیامت آجاتی ہے۔ عزت کا جنازہ نکل جاتا ہے ۔۔۔ اور باپ دادا کی ناک ۔۔۔ معاف کرنا ۔ جو خود ہی کئی بار کاٹ چکے ہوتے ہیں ۔۔۔ یکایک لمبی ہو کر دوبارہ کٹنے پر تیار ہو جاتی ہے ۔"

"آپ ایسا نہ کہیں صاحبزادہ پیکر ۔۔۔ بزرگوں کی کسی بات پر انگلی

اٹھانا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"خدا حافظ" پیکر جاہ نے آہستہ سے کہا۔ اور پہلے ثروت جہاں ——— اور پھر پیکر جاہ وہاں سے چلے گئے۔

سپہر آرا بیگم وہیں بنگلیا کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔ اپنے بیٹے کی شرافت پر وہ اس وقت بیحد مسرور تھیں۔ "پیکر جاہ اپنے باپ سے سے کتنا مختلف ہے۔ کتنی سچی بات کہی ہے پیکر نے کہ یہاں عیاشی کے نام پر سب کچھ کرنا جائز ہے۔ لیکن شرافت سے کوئی کام کرو تو سب کی بے عزتی ہوتی ہے۔ اسی وقت انھوں نے بیٹے کی خوشیوں کو پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

شاندار جاہ حسبِ معمول آئے۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد پیکر کا ذکر چھیڑ دیا ———

"ماشاء اللہ پیکر انیس ۱۹ برس کے ہو گئے۔ سوچتا ہوں کہ اب ان کی شادی کر دوں" ———

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں" ———

"سپہر آرا نے خوش مزاجی سے کہا۔ خلاف معمول انھوں نے شوہر کی بات سے اختلاف نہیں کیا تو شاندار جاہ کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔ کہنے لگے۔

"باجی جان کہہ رہی ہیں کہ جب میں شادی کر دی جائے۔ گیتی بھی ماشاء اللہ پندرہ برس پورے کر کے سولھویں میں قدم رکھ چکی ہے۔ آپ اسی لحاظ سے تیاری کر لیجئے۔ میں باجی سے تاریخیں طے کرنے کے لیے کہہ دوں گا۔"

"میری تیاری مکمل ہے۔ بس وقت کا انتظار ہے"۔ سپہر آرا نے مسکرا کر کہا۔ اور شاندار جاہ شادی کے لیے چوڑے منصوبے بناتے رہے۔ اور سپہر آرا

بیٹھی مسکراتی رہیں، پھر اٹھ کر بہن کو خوش خبری سنانے چلے گئے ۔۔۔
سچ تو یہ ہے کہ انھیں ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ بیگم مان گئی ہیں۔ انھیں تو انکار کا یقین سا تھا۔ لیکن اس بار توخلاف امید انھوں نے چپ بچپاتے ۔۔۔ بلکہ ہنسی خوشی بات مان لی تھی ۔۔۔
شاندار جاہ نے بہو کی منھ دکھائی میں دینے کے لیے کندن کا جڑاؤ سیٹ بنوایا ۔۔۔ وہ بیگم کو دکھانے لائے۔ سپہر آرا نے سیٹ دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور مڑ کر اپنی ذاتی ملازمہ اکبری کو اشارہ کیا ۔۔۔ اکبری چلی گئی ۔۔۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہمراہ لمبا سا زرتار گھونگھٹ نکالے ۔ سج سج کر قدم رکھتی ہوئی ایک دلھن بھی آ گئی ۔
" دلھن بیگم! خسر صاحب کو تسلیم کرو ۔"
سپہر آرا نے حکم دیا۔ دلھن نے جھک کر تسلیم کی۔ اور سپہر آرا نے دلھن کا گھونگھٹ اٹھا دیا ۔۔۔ ثروت جہاں قیمتی لباس اور زیورات میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔
" یہ سپیکر کی دلھن ہے ۔"
سپہر آرا نے تعارف کرایا ۔۔۔
" لیکن ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ "
شاندار جاہ بُری طرح گھبرا گئے ۔۔۔ وہ اس حادثے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔
"ہمارا بچہ اتنا نالائق نہیں بلکہ وہ آپ کے حکم سے سرتابی کرے۔ لیکن میں نے اس کی پسند کا خیال کر کے اس کا نکاح ثروت جہاں سے کر دیا ہے۔ بات تو وہی ہے ۔۔۔ بس ذرا سی روایت بدل گئی ہے۔ اب اسے عیاشی کے لیے کسی متعہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی ۔۔۔ گیتی آرا سے شادی ہونے کی صورت میں پرانی روایت ضرور دہرائی جاتی ۔۔۔ اور الزام کس پر آتا ۔۔۔ ؟ "
سپہر آرا نے بات ختم کر دی ۔۔۔
شاندار جاہ نے کانپتے ہاتھوں سے زیور کا بکس ثروت جہاں کے ہاتھ میں دیا ۔۔۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا ۔۔۔ اور باہر چلے گئے ۔۔۔

○